ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

مارچ ۲۰۱۸ء | جلد ۹ | شمارہ ۹ | جمادی الثانی ۱۴۳۹ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی
(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مجلس مشاورت

- مولانا سید سلمان الحسینی ندوی
- مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
- محمد قمر عالم لکھنوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
- مولانا محمد اخلاق ندوی

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

مجلس ادارت

- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- محمد قمر الزماں ندوی

سرکولیشن انچارج

سعید احمد ندوی 9808850029
محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

شرح خریداری

فی شمارہ:	25:00روپے
سالانہ:	250:00روپے
سالانہ اعزازی ممبرشپ:	500:00روپے
بیرونی ممالک:	30$ ڈالر
لائف ممبرشپ (۲۰ سال):	4000:00روپے

خط و کتابت کا پتہ: مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر 'ڈی' کوارسی بائی پاس، علی گڑھ 202002

e-mail: nidaeaetidal@gmail.com, visit us: www.nadwifoundatioaligarh.org

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at *Ideal Graphics Enterprises*, Patwari Nagla, Aligarh

Dsg. & Comp. by: Abdur Rehman Araria, # arehman412@yahoo.in

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	اطاعت خداوندی سے انحراف باعث ذلت ہے	محمد عارف ندوی	
۲۔	اداریہ	اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے	معاون مدیر	۳
۳۔	عہد رفتہ	اربابِ صدق وصفا	مولانا ابوالکلام آزادؒ	۵
۴۔	اسلامی تعلیمات	خاندانی نظام کا استحکام اسلام کی روشنی میں	حافظ کلیم اللہ عمری	۸
۵۔	فقہی مباحث	ہاتھ یا سر کے اشارے سے سلام کرنا: ایک فقہی بحث	محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی	۱۶
۶۔	تعلیم و تربیت	تربیت اولاد- چند اہم گوشے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۲۰
۷۔	تجزیہ	ہندوتوا کا ایجنڈا اور مسلم پرسنل لاء	سید احمد ومیض ندوی	۲۴
۸۔	انکار حدیث	استاد احمد امین اور حدیث پر اعتراضات	محمد فرید حبیب ندوی	۳۱
۹۔	فکر اسلامی	مفکر اسلام- ایک مطالعہ (قسط-۲۴)	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۳۶
۱۰۔	علوم وفنون	علم تجوید وقراءت، اہمیت اور ضرورت: ایک جائزہ	بصیرت فاطمہ	۴۱
۱۱۔	قضیۂ فلسطین	مسجدِ اقصی اور ہماری ذمہ داریاں	محمد حماد کریمی ندوی	۴۵
۱۲۔	سوانح	مولانا عاشق الٰہی میرٹھی، اردو کے صغیر سن مترجم.....	ندیم احمد انصاری	۴۷
۱۳۔	شخصیات	امین الامت حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ	ترجمہ: محمد عالم ندوی	۵۲
۱۴	// //	تاریخ تیری قربانیوں پہ رقصاں ہے	شہباز نعمانی سنبھلی	۵۵
۱۵	تعارف کتب	تفسیر ماجدی: گوناگوں خصوصیات کی حامل	نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی	۵۸
۱۶	آخری صفحہ	طبقۂ نسواں پر رحمتِ عالم کا احسان	م۔ق۔ن۔	۶۴
۱۷	نعت	بہتا ہی رہے گا ترے الطاف کا دھارا	ماہر القادریؒ	

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے

اس وقت ہندوستانی مسلمان تعلیمی بدحالی، معاشی کسمپرسی، سیاسی بے وزنی، مستقبل کی طرف سے مایوسی و بے اطمینانی اور ارتداد کے بڑھتے سیلاب جیسے بے شمار مسائل سے دوچار ہیں، مگر ان سب سے بڑھ کر ایک مسئلہ اور ہے، جس پر عموماً توجہ نہیں دی جاتی، جب کہ وہی ''ام المسائل'' ہے، اور وہ ہے ''شعور کا فقدان''۔ یہی ہمارے تمام مسائل کی بنیاد ہے اور اسی پر حالات کی تبدیلی موقوف ہے۔

شعور کہتے ہیں اپنی ذات اور اپنے اردگرد کے حالات سے باخبر ہونے کو، شعور ذات سے انسان کے اندر بندگی، حب خداوندی، تعلق مع اللہ اور اچھے اوصاف و نیک اخلاق پروان چڑھتے ہیں، حالات کے شعور سے اس میں ملک و معاشرے کے تئیں ہمدردی و بہی خواہی اور ان کی ترقی و کمال کے جذبات اور انھیں ہلاکت و بربادی سے بچانے کی ہمت و جرأت پیدا ہوتی ہے۔ جبکہ ذات کی بے شعوری کفر و شرک، کبر و استعلاء، برے اخلاق اور بری عادتوں کو وجود بخشتی ہے، اور حالات کی بے شعوری حالات کی مزید ابتری اور ملک و ملت کی تباہی کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ اور اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ ہماری اکثریت کو نہ اپنی ذات کا صحیح شعور ہے اور نہ اپنے گرد و پیش کے حالات کا، ذات کی بے شعوری کا عالم یہ ہے کہ ہم بھی ''ولا تکونوا کالذین نسوا اللہ فأنساھم أنفسھم'' سے آنکھیں بند کر کے خدا فراموشی کے نتیجے میں خود فراموشی تک جا پہنچے ہیں، ہم اپنی اہمیت و افضلیت کے ادراک سے قاصر ہیں، ہم بھی اپنا امتیاز کھو کر دیگر قوموں کے نقش قدم پر ہیں، نہ بندگی ہے، نہ بندگی کا شعور، نہ خدا کی یاد ہے نہ آخرت کا یقین، مادی خواہشات اور دنیوی منافع و لذات نے ہمیں اس طرح جکڑ رکھا ہے کہ ہمارا پورا وجود اسی دنیا کا ہو کر رہ گیا ہے، جب کہ ہمیں یہ سبق دیا گیا تھا کہ ''إن الدنیا خلقت لکم وإنکم خلقتم للآخرۃ''، اور ہم سے کہا گیا تھا کہ یہ دنیا ''قید خانہ'' ہے، مگر شاید ہم اسی قید خانے کو ''دار القرار'' سمجھ بیٹھے ہیں۔ اور جب آخرت کی فکر ہی نہ رہی، تو پھر اعمال کی کیا ضرورت! اب دیکھئے آپ کو مسلمانوں میں چور بھی مل جائیں گے، ڈاکو بھی، زانی بھی، سود خور بھی، شرابی بھی اور رشوت کھانے والے بھی، اور ایسے بھی مل جائیں گے جو ان سارے احکام کا مذاق اڑاتے ہوں گے اور انہیں ''داستان ماضی'' اور ''قصۂ پارینہ'' قرار دیتے ہوں گے، اور ایسے بھی ہوں گے جو ان محرمات کے جواز کی تجویزیں پیش کرتے ہوں گے، جو نماز روزے کی پابندی اور حج و قربانی کے فلسفے کے منکر ہوں گے۔ اور یہ سب اسی لئے ہے کہ ایسے لوگ ''شعور ذات'' سے محروم ہیں۔

اسی طرح حالات کی بے شعوری کا عالم یہ ہے کہ ایک طرف ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل داؤں پر ہے، ان کے ایمان

وعقیدے کو چھیننے کی سازشیں ہیں،مگر دوسری طرف ہماری بڑی تعداد ابھی بھی خطرات کی بوسونگھنے میں ناکام ہے،آپ کسی مسلم بستی سے گذر جائیے،آپ کو آج بھی وہی ہلڑ بازی،اسراف وفضول خرچی،ڈھول تماشے اور گانے بجانے،اور وہ ساری خرافات دیکھنے مل جائیں گی،جو کسی بھی قوم کی ہلاکت کے لئے کافی ہوتی ہیں،آپ دیکھیں گے کہ وہ لوگ بڑے مزے میں ہیں،سرمستیاں اور شوخیاں کررہے ہیں،کھیل کود رہے ہیں،انھیں حالات کی سنگینی کا کوئی احساس نہیں،وہ آج بھی اسی طرح بدمست و بے فکر ہیں،جیسے پہلے تھے،انھیں قطعاً اندازہ نہیں کہ آئندہ چند سالوں میں کیا کچھ کرنے کی سازشیں ہوچکی ہیں اور ان کا دشمن کیا منصوبے بناچکا ہے۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا،اکثریت کو دیکھ کر کہا گیا ہے،اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام ہی مسلمان ایسے بے شعور اور بے فکر ہیں،ایک بڑی تعداد- اورالحمدللہ یہ تعداد روزافزوں ہے-ایسی بھی ہے جو پوری طرح بیدار اور چوکنا ہے،اسے شعور ذات بھی حاصل ہے اور شعور حالات بھی،وہ ہر طرح سے مسلم قوم کو بیدار کرنے کی کوششوں میں لگی ہے،اور بیداری بڑھ رہی ہے۔

مگر اکثریت اور بڑی اکثریت کا حال ابھی بھی مریضانہ ہے،اس لئے ضرورت ہے کہ اسے حالات کے صحیح رخ سے باخبر کیا جائے،اس میں اپنی حفاظت و بقا اور اپنے ایمان وعقیدے کی سلامتی کی فکر پیدا کی جائے،اور بے شعوری و بے حسی اور بے پروائی کو دور کیا جائے،یہ کام کئی طریقوں سے انجام دیا جاسکتا ہے:

۱۔ مکاتب کا ایسا نظام بنایا جائے کہ کوئی مسلم بچہ مکتب کی تعلیم سے محروم نہ رہے۔

۲۔ اسکول ومدارس میں طلبہ کے سامنے اس مقصد سے لکچرز دیے جائیں۔

۳۔ جمعے کے دن فکرانگیز اور حالات کے صحیح تجزیہ پر مبنی خطبات پیش کئے جائیں،اور ان کے ذریعے لوگوں کو موجودہ حالات کے بارے میں صاف صاف بتایا جائے۔

۴۔ محلوں کو ٹارگٹ کرکے انفرادی ملاقاتوں کے ذریعے ذہن سازی کی جائے۔

۵۔ چھوٹے چھوٹے پروگرام کئے جائیں،جس میں بس آس پاس کے لوگ جمع ہوں،اور ایسا ہر ہر محلے میں کیا جائے،اس لئے کہ ایسے پروگرام ذہن سازی کا زیادہ اچھا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں،یہ کام اس بڑے پیمانے پر ہو کہ کوئی بستی اور محلّہ اس سے خالی نہ رہے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے طریقے ہیں،جن کی مدد سے حالات کا صحیح شعور پیدا کیا جاسکتا ہے،جس سے جو بھی بن پائے،وہ کر گذرے،یہی وقت کا تقاضا اور خدا کی طرف سے مطلوب ہے۔

محمد فرید حبیب ندوی

❑ عہد رفتہ

اربابِ صدق و صفا

مولانا ابوالکلام آزادؒ

اکبر کی امامت کے محضر کا یہ حال ہے کہ شیر شاہ اور سلیم شاہ کے زمانہ میں دنیا پرست عالموں کی کثرت و طاقت نے ملک کے امن وسکون کو تہہ و بالا کر رکھا تھا، اور علی الخصوص اہل اللہ اور اربابِ حق پر انھوں نے اپنے غرورِ دنیا اور نشۂ حکومت و ریاست میں بڑے بڑے مظالم و شدائد کیے تھے۔ جس کسی کو طلب دنیا سے مستغنی اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں سرگرم دیکھتے، اپنی دنیا پرستیوں کا حریف سمجھ کر مخالف ہو جاتے، اور کوئی نہ کوئی الزام تراش کر فتنہ و مصائب میں مبتلا کر دیتے، اکبر کے ابتدائی عہد تک یہی حال رہا۔ ان علما سے حکومت میں دو شخصوں نے بہت بڑا عروجِ دنیاوی پایا تھا۔ مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری اور شیخ عبدالنبی صدر الصدور۔ انہی لوگوں کے ظلم وستم کا ایک قتیل خاندانِ ملّا امبارک بھی تھا، اور ملا موصوف کے تبحر علمی، فقر و استغناء، اور بے باکانہ امر بالمعروف کی سرگرمیوں سے وہ سخت عاجز آ گئے تھے۔ ایک عرصے کے بعد جب حالات بدلے اور ملا مبارک کے خاندان کو عروج ہوا تو انھوں نے ان لوگوں کے زور کو توڑنا چاہا اور اس کی تدبیر یہ نظر آئی کہ مذہبی تعصب کی شدت کو کس طرح کم کیا جائے، چنانچہ حکمت و تحقیق جدید کے نام سے آزاد خیالی و مطلق العنانی کی ہوائیں چلنے لگیں، لیکن افسوس کہ مرض کو دور کرنے کے لیے ایسا نسخہ تجویز کیا گیا، جو آگے چل کر ایک دوسرے مرض کی تولید کا باعث ہو گیا۔ پہلے افراط تھی، تو اب تفریط ہو گئی، پہلے تعصب و اوہام تھے، تو اب ان کی جگہ الحاد و بے قیدی نے نشو ونما پائی، اور تاریخ مذہب کے ہر گذشتہ دور کی طرح اس دور میں بھی افراط کی دو جماعتیں پیدا ہو گئیں۔ پہلی جماعت علمائے دنیا پرست اور متعصبین جاہلین کی تھی، جو اپنی ہوا پرستیوں اور تعصب و جہالت سے اصل مذہب کو بدنام کر رہے تھے؛ دوسری جماعت ان کے مدمقابل مدعیان تحقیق جدید و اجتہادِ فکر کی تھی، جنھوں نے حکمت و دانشمندی اور مذہب عقلی و طریق حکیمانہ کے نام سے الحاد و بے دینی اور اباحت و بے قیدی کی گرم بازاری کر رکھی تھی۔ اور اہل حق و اقتصاد کا طریق ان دونوں سے الگ تھا، وہ جس طرح پہلی جماعت کے تسبیح زُور اور خرقۂ سالوس سے بیزار تھے، اسی طرح دوسری جماعت کے فریبِ عقل اور فتنۂ دانش و آزادی سے:

از آں دعویٰ بشیخ و برہمن ماند
کہ ہر یک داورے رامی پرستند

یہی صورت حال آج بھی درپیش ہے، مذہب کے

دکانداروں نے جہل وتقلید اور تعصب و ہوا پرستی کا نام مذہب رکھا ہے، اور روشن خیالی وتحقیقِ جدید کے عقل فروشوں نے الحاد و بے قیدی کو حکمت و اجتہاد کے لباسِ فریب سے سنوارا ہے، نہ مدرسہ میں علم ہے، نہ محرابِ مسجد میں اخلاص، اور نہ مے کدے میں رندانِ بے ریا، اربابِ صدق وصفا ان سب سے الگ ہیں، اور سب سے پناہ مانگتے ہیں، ان کی راہ دوسری ہے:

ہم کعبہ وہم بت کدہ سنگ رہِ ما بود
رفتیم وصنم برسرِ محراب شکستیم

عہد اکبری میں بھی اربابِ حق وصفا کا جو گروہ تھا، وہ ان دونوں سے الگ تھا اور چونکہ دربارِ شاہی پر بدبختانہ یکے بعد دیگرے انہی دو گروہوں کا تسلط رہا، اس لیے ان کو طرح طرح کے مصائب و آلام سے دو چار ہونا پڑا۔ حضرت شیخ جمال الدین بھی انہی لوگوں میں سے تھے، خاندان ملا مبارک (یعنی ابو الفضل وفیضی) نے مولویوں کا زور توڑنے کے لیے ایک تدبیر یہ کی کہ ۹۸۷ھ میں اپنے والد ملا مبارک سے ایک محضر تیار کرایا مضمون یہ تھا کہ

''پادشاہ خلیفۃ الزماں اور امام عہد واجب الاطاعت ہے، اور اس کو حق پہنچتا ہے کہ مسائل مختلف فیہا میں حسبِ ضروریاتِ وقت اجتہاد کرے، اور اس کا اجتہاد واجب العمل ہے''۔

اصلا تو یہ بات ٹھیک تھی، فی الحقیقت خلیفۂ وقت وارباب حل وعقد واصحابِ شوریٰ کو ہر عہد و دور میں حقِ اجتہاد حاصل ہے، اور اسی کے سد باب نے تاریخ اسلام کے تمام مصائب کی بنیاد ڈالی۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ اکبر بالکل مذہب سے بے خبر تھا، اور اس کے مشیروں کا رنگ دوسرا تھا۔ نتیجہ یہ نکلتا (اور نکلا کہ) پادشاہ کی امامت واجتہاد، بے قیدی والحاد کا ایک محکم ذریعہ بن جاتی اور بالآخر بنی۔ اس لیے ضرور تھا کہ علمائے حق کو اس محضر کے قبول کرنے میں سخت تامل ہو۔

لیکن حکومت کے زور کے آگے کس کی چلتی ہے؟ علمائے سوء نے اپنی بداعمالیوں سے اپنا اثر پہلے ہی کھو دیا تھا؛ مجبوراً سب کو دستخط کرنے پڑے، سب سے پہلے انہی گردن کشوں نے سر جھکایا، جن کی رگِ گردن سب سے زیادہ موٹی تھی، اور جس کی فصد کھولنے کے لیے یہ نشتر تیز ہوا تھا یعنی ملا عبد النبی صدر اور مخدوم الملک نے، پھر قاضی القضاۃ جلال الدین ملتانی اور شیخ عبد الحی مفتی وغیرہ سب نے بلا چون وچرا اپنی اپنی مہریں ثبت کر دیں، اور علمائے دربار میں سے کسی کو انکار وتامل کی جرأت نہ ہوئی، ملا عبد القادر بدایونی ۹۸۷ھ کے وقائع میں لکھتے ہیں:

''دریں ایام محضرے بخط ومہر مخدوم الملک وشیخ عبد النبی صدر الصدور وقاضی جلال الدین ملتانی کہ قاضی القضاۃ بود، و صدرِ جہان مفتی کل، وشیخ مبارک کہ اعلم العلمائے زمان بود، وغازی خان بدخشی کہ در علمِ معقول بے نظیر بود، در بابِ تفضیل امامِ عادل مطلقا بر مجتہد، وتجویزِ ترجیح او روایتِ مرجوحہ را در مسئلۂ مختلف فیہا درست کروند..... سخن در آں (باب) باطناب کشید..... بالآخر بعضے بطوع وبعضے بکرہ برآں محضر مہر ہا کردند''۔ (جلد دوم صفحہ ۲۷۰)۔

ہم بڑی چیز سمجھتے تھے، یہ مے خانے میں
نکلا اک جام کی قیمت بھی نہ ایماں اپنا

اللہ اللہ! کیا انقلابِ وقت ہے! یہ وہی مہریں ہیں جو کبھی علمائے حق کی تکفیر وتضلیل کے فتووں پر ثبت ہوتی تھیں، اور ان کے قتل وسلب کے فرامین کا دامن سیاہ کرتی تھیں۔ آج ایک اَن

پڑھ نوجوان کی امامت واجتہاد کی تصدیق کررہی ہیں، تاکہ یہ مصدقہ امامت کل کوخود انہی کے آگے آئے، اوراپنے پہلے ہی جھونکے میں ان کی شیخ الاسلامی اور مذہبی فرماں روائی کا چراغِ غرورگل کردے:

نہ لپٹیں، نہ ہوں قتل؛ انصاف یہ ہے
کہ ہم خود بد آموزِ قاتل ہوئے ہیں۔

افسوس! ہرعہداور ہردور میں جس قدر بربادیاں ہوئیں، علمائے سوء ہی کے ہاتھوں ہوئیں؛ وقت اورزمانے کی شکایت بےسود ہے:

تاکے ملامتِ مژۂ اشکبار من
یک با ہم نصیحتِ چشمِ سیاہِ خویش

سچ یہ ہے کہ عہد اکبری کے تمام فتنہ وفساد کے اصل ذمہ دار یہی علمائے عبیدالدنیا ہیں نہ کہ ابوالفضل وفیضی، حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ اسی عہد کی نسبت اپنے مکاتیب میں بار بار لکھتے ہیں۔ ''ہرفتورے کہ دریں زمان درترویجِ ملت ودین ظاہر گشتہ، ازشومیِ علمائے سوءاست کہ فی الحقیقت اشرارِمردم ولصوصِ دین اند''۔ أولئك حزب الشيطان الا ان حزب الشيطان هم الخاسرون، اکبرنے تمام حاملین مذہب کا یہ حال دیکھا تو سرے سے مذہب ہی کوخیرباد کہہ دینا چاہا، خودابوالفضل وفیضی کوبھی انہی لوگوں نے اپنی ہواپرستیوں اورظلم وعدوان کے نمونے دکھلاکر اس طریقہ میں آنے کی دعوت دی تھی، جس کی بے اعتدالیاں دیکھ دیکھ کر وہ خود بھی متاسف ہوتے ہوں گے مقصود کیا تھا اور کیا سے کیا ہوگیا؟ انھوں نے علمائے سوء کے غرور وپندار کا بت توڑنے کے لیے ایک دوسرا بت تیار کیا، جس کا نام اکبر تھا۔ لیکن آگے چل کر خود اسی بت کی پرستش شروع ہوگئی، فیضی نے اگر علمائے وقت کی نسبت یہ کہا تھا تو کیا غلط کہا تھا؟

زباں کشیدہ بدارالقضاے عجب وریا
شہود کذب زدعویٰ گرانِ ایمانی
اگر حقیقت اسلام در جہان این ست
ہزار خندۂ کفرست بر مسلمانی

دارالحکومت کے علماے دربار نے جب اس محضر کی تصدیق کردی، تو ضرورت ہوئی کہ ملک کے سربرآوردہ علماء کو بھی قابو میں لایا جائے، دارالحکومت کے بعد سب سے بڑا مقام دہلی تھا، اور مرکزِ علم ہونے کے اعتبار سے اس پر فائق، وہاں کے اصحاب درس وتدریس میں مولانا شیخ جمال الدین ممتاز تھے، معلوم ہوتا ہے کہ اسی محضر پر دستخط کرنے کے لیے شیخ موصوف کو مجبور کرنا چاہا، لیکن جیسا کہ اوپر گذر چکا، دربار کی طاقت اور علمائے وقت کا اجتماع ان کو مرعوب نہ کرسکا، اور صاف انکار کردیا، شیخ موصوف کی زندگی کا یہ واقعہ نہایت اہم ہے، اوراس سے ان کی حق پرستی اور بےلوث زندگی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس محضر پر دستخط نہ کرنا گویا اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا تھا، اور دربارِوقت کو اپنی مخالفت کا یقین دلانا، یہ وہ پرشور ونازک وقت تھا کہ بڑے بڑے دعوے داروں کے قدم ڈگمگا گئے تھے، مگر سچ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قیام حق کے لیے جن اہل اللہ کا شرح صدر کردیتا ہے، ان کی استقامت کو کوئی طاقت متزلزل نہیں کرسکتی۔ ألا ان اولياء الله لا خوف عليهم ولا هم يحزنون۔

☆☆☆

❑ اسلامی تعلیمات

خاندانی نظام کا استحکام اسلام کی روشنی میں

حافظ کلیم اللہ عمری مدنی

اللہ کی قدرت کا یہ کرشمہ ہے کہ جس مرد اور عورت میں کبھی ملاقات نہیں ہوتی، کوئی رشتہ داری نہیں ہوتی ان کے دلوں میں نکاح کے ذریعہ ایک دوسرے کیلئے محبت موجزن ہوجاتی ہے اور رحمت وہمدردی کے سوتے پھوٹ پڑتے ہیں اور زوجین ایک دوسرے پر جان نثار ہوجاتے ہیں، یہ سب محض اللہ تعالی کی قدرت کا کرشمہ ہی تو ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (الروم : ۲۱) یعنی ''اللہ کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں تا کہ تم ان سے آرام پاؤ، اس نے تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی قائم کردی، یقیناً غور وفکر کرنے والوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔'' مطلب یہ ہے کہ اگر مرد اور عورت کی جنس ایک دوسرے سے مختلف ہوتی تو ان سے وہ سکون کبھی حاصل نہ ہوتا جو ایک ہی جنس ہونے کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔

نکاح زوجین کے مابین ایک معاہدہ ہے جس میں ایک طرف سے کفالت اور پرورش کی ذمہ داری ہے تو دوسری طرف سے اطاعت وفرمانبرداری، اور یہ نکاح درحقیقت ایک دائمی معاہدہ ہے، زوجین اس عہد وپیمان سے اچھی طرح واقف ہوں تا کہ مستقبل میں یہ رشتہ مستحکم ثابت ہو۔

دین اسلام میں نکاح کے ذریعہ عورت اور مرد چند دن کے عیش یا تفریح کے لئے نہیں ملتے بلکہ زندگی بھر کی رفاقت، الفت ومحبت کی خاطر ایک مضبوط عہد کے تحت رشتہ نکاح سے منسلک ہوجاتے ہیں، قرآن کریم نے اسے **میثاقا غلیظا** سے تعبیر فرمایا (النساء: ۲۱) یعنی مضبوط عہد و پیمان، اسلام نے سکون دل کے واسطے جنسی جذبات کی تسکین کی خاطر نکاح کی ترغیب دی کیونکہ یہ ایک انسان کی ضرورت ہے، اسی وجہ سے شریعت نے نکاح کو عبادت کا درجہ دیا ہے، نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اپنی بیوی سے ہم آغوش ہونے میں بھی تمہارے لئے صدقہ کا ثواب ہے (مسلم)۔

حضرتِ انسان کو اللہ تعالی نے جو امتیازات عطا فرمائے ہیں، اس میں ایک خاندان بھی ہے، والدین کے نکاح کے ذریعہ دادیہال اور نانیہال نیز خود اپنے نکاح کے ذریعہ سسرالی رشتہ وجود میں آتا ہے، ان تینوں خاندانوں کے ذریعہ انسان کو رشتہ داروں کا ایک بڑا حلقہ حاصل ہوتا ہے، جو مصیبتوں میں کام آتا ہے، جن کی دلداری سے غم انگیز حالات میں دل کا بوجھ کم ہوتا ہے، اور خوشی کے مواقع پر خوشیاں دوبالا ہوجاتی ہیں، اگر آپس میں اختلاف ہو تو سب لوگ مل کر اس کو رفع دفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں، آئندہ نسلوں کا رشتہ طے کرنے میں سہولت ہوتی ہے، اسی لئے قرآن مجید نے خاندان کو ایک نعمت قرار دیا ہے،

اور اپنے جن احسانات کو شمار کرایا ہے، ان میں ایک خاندان کا وجود بھی ہے، ارشاد باری تعالی ہے۔ وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا وَكَانَ رَبُّكَ قَدِیْرًا (الفرقان:۵۴) ترجمہ: اور وہی تو ہے جس نے پانی سے آدمی پیدا کیا پھر اس کو صاحبِ نسب اور صاحبِ قرابت دامادی بنایا اور تمہارا رب (ہر طرح کی) قدرت رکھتا ہے۔

خاندانی نظام کا استحکام بے حد اہم ہے اور خاندان کا ٹوٹ اور بکھر جانا اسی قدر نقصان دہ ہے، موجودہ مغربی تہذیب نے شخصی آزادی کے تصور کو اتنی وسعت دے دی کہ افراد پر خاندان کی گرفت کمزور ہوگئی، خاص کر طلاق کے واقعات بہت بڑھ گئے، اور اب خود مغربی معاشرہ اس نقصان کو محسوس کر رہا ہے؛ لیکن اب وہ اتنی دور جا چکا ہے کہ اس کی واپسی دشوار ہے، مادہ پرستی یا مادی ذہنیت کی وجہ سے انسان خود بھی پریشان ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی پریشان کرتا ہے، خاندانی نظام کو مستحکم کرنے اور اسے مضبوط بنانے کے لئے چند قابل توجہ باتوں کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔

۱۔ اخلاص نیت:

خاندانی نظام کو مستحکم بنانے کے لئے نکاح مسنون ایک مؤثر ذریعہ ہے، جس طرح ہر عمل کے لئے اخلاص وللّٰہیت مطلوب ہے، اخلاص کی بدولت اللہ کی مدد شامل حال ہوتی ہے، نکاح سے قبل بھی نیک نیتی شرعاً مطلوب ہے، ورنہ اس کے نقصانات سے دوچار ہونا لازم ہوگا۔ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص کسی عورت سے اس کی دنیوی عزت وحیثیت کی وجہ سے شادی کرے گا تو اللہ اس کی ذلت ہی میں اضافہ کرے گا اور جو شخص اس کے مال ومتاع کے سبب سے شادی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے فقر وفاقہ میں اضافہ کرے گا اور جو اس کے حسب ونسب کے سبب سے نکاح کرے گا تو اللہ اس کو پست کردے گا اور جو شخص کسی عورت سے صرف اس لیے نکاح کرتا ہے کہ اس کی اپنی نگاہیں نیچی رہیں، شرم گاہ محفوظ رہے اور صلہ رحمی کرے تو اللہ تعالیٰ ان دونوں (زوجین) کو ایک دوسرے کے لیے مبارک بنادے گا۔ (معجم الأوسط، ۲۳۴۲)

مذکورہ حدیث کی روشنی میں یہ بات عیاں ہے کہ حسن نیت کی کمی اور دینداری کے مفقود ہونے کی وجہ سے دنیوی زندگی کی برکتیں اٹھ جاتی ہیں، نتیجے میں شادی کی حقیقی خوشیوں سے محرومی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

۲۔ نکاح کے لئے صحیح معیار انتخاب:

مستحکم خاندانی نظام کی بنیاد تقوی وطہارت، دینداری اور اخلاق وکردار پر ہونا چاہیے، جیسا کہ ارشاد نبوی ﷺ ہے، عورت سے نکاح چار اسباب کی بنیاد پر کیا جاتا ہے (۱) مال کی وجہ سے (۲) خاندان کی وجہ سے (۳) حسن وجمال کی وجہ سے (۴) دین کی بناء پر، پس تم دین دار عورت کا انتخاب کرلو تا کہ تمہارا بھلا ہو۔ (بخاری، مسلم)

مال ومتاع، حسن وجمال اور خاندان کا اثر ورسوخ وغیرہ عارضی چیزیں ہیں مگر دین ہر اعتبار سے فلاح دارین کا ضامن ہے۔ دیندار خاتون کے ذریعہ ایک خاندان اور نسل کی اصلاح مقصود شرعی ہے، سچ فرمایا آپ ﷺ نے: تمام دنیا سامان زندگی ہے اور دنیا کی بہترین متاع (سامان) نیک بیوی ہے (مسلم)۔ اسلام نے مردوں کے انتخاب میں بھی تقوی اور دینداری و دیانت داری کو معیار بنانے کا حکم دیا ہے جیسا کہ ارشاد نبوی ﷺ ہے: جب تمہارے پاس کوئی ایسا شخص آئے جس کے دین اور اخلاق سے تم مطمئن ہو تو تم اس سے شادی کردو، ورنہ زمین میں فتنہ اور فساد عظیم برپا ہوگا۔ (ترمذی ۱۰۸۴ الصحیحۃ ۱۰۲۲ الارواء ۱۶۶۸)

۳۔ عائلی زندگی میں حسنِ معاشرت:

ارشاد باری تعالی ہے " وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ

كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا "(النساء : ۱۹) ترجمہ :اوران کے ساتھ معاشرت اور بودوباش میں اچھا برتاؤ کرو۔اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ تمہیں ایک چیز ناپسند ہو اور اللہ تعالی نے اسی میں تمہارے لئے بہت سی بھلائیاں رکھی ہوں۔

اللہ رب العزت نے بیویوں کے ساتھ قول وفعل کے ذریعہ اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے، اس لئے کہ بعض مواقع پر بُرا برتاؤ تعلقات میں کشیدگی اور شوہر کی نافرمانی کا ذریعہ اور سبب بن سکتا ہے، مذکورہ آیتِ کریمہ میں ہمارے لئے درس عبرت یہ ہے کہ بالفرض میاں بیوی کے مابین اگر نفرت پیدا ہوجائے تو صبر جمیل اور تحمل سے کام لینا ضروری ہے اس لئے کہ غیظ وغضب کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا، میاں بیوی کے تعلقات کی استواری سے دو خاندانوں کے تعلقات مستحکم ہوتے ہیں اوران کی نااتفاقی اور جدائی کے سبب دو خاندانوں کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اسی لئے اللہ تعالی نے ہر معاملہ میں سنجیدگی اور متانت کو لازم قرار دیتے ہوئے حسن معاشرت پر زور دیا ہے، بسا اوقات شوہر بیوی کی کسی خصلت سے متنفر بھی ہوجائے تو ممکن ہے کہ اس ناپسندیدہ چیز کو برداشت کرنے میں بہت سی بھلائیاں رکھی ہوئی ہوں اوراس کا علم فی الفور شوہر کو نہ ہو مثلاً، اللہ تعالی اس عورت کے بطن سے نیک اولاد عطا فرمائے اور صبر کرنے پر اجر عظیم دنیا وآخرت میں نصیب ہوجائے۔

ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی مؤمن مرد کسی مومن عورت سے نفرت نہ کرے اگر اس کی ایک خصلت اسے بری لگے تو دوسری کوئی خصلت اچھی لگے گی (مسلم)، اسلام نے بیوی کے ساتھ حسن سلوک کی بڑی تاکید فرمائی ہے اور برائیوں کے مقابلہ میں اچھائیوں اور عیوب کے مقابلہ میں اسکی خوبیوں پر نظر رکھنے کی تعلیم دی ہے، آپ ﷺ کا ارشاد ہے" تم میں سے سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ بہتر ہے اور میں اپنی بیویوں کے لئے تم سے اچھا ہوں۔(ترمذی، ابن ماجہ، حاکم السلسلۃ الصحیحۃ ۱/۲۸۴ رقم ۲۸۵)

٤۔مستحکم خاندانی نظام کے لئے اسوہ نبوی ﷺ کی ضرورت:

نبی کریم ﷺ کو بھی اللہ تعالی نے دیگر نبیوں کی طرح ایک بہترین خاندان عنایت فرمایا، آپ کی گیارہ بیویاں تھیں، چار بیٹیاں اور تین بیٹوں پر مشتمل ایک پیار بھرا پریوار تھا، نواسے اور نواسیاں بھی تھیں، آپ ﷺ کا برتاؤ ازواج مطہرات کے ساتھ اور اہل خانہ کے ساتھ غایت درجہ مشفقانہ تھا، آپ شریفانہ اور فاضلانہ اخلاق کے حامل تھے، گھر والوں کی چھوٹی اور بڑی ضرورتوں کا پورا خیال رکھتے تھے، گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹاتے، گھر میں جھاڑو دیتے، آپ ہمیشہ ازواج مطہرات سے ساتھ خندہ پیشانی کے ساتھ معاملہ فرماتے، کبھی کبھار ہنسی مذاق بھی کرلیتے اورام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ بنت صدیق رضی اللہ عنہما کے ساتھ دوڑ لگاتے، ازواج مطہرات کے ساتھ مل جل کر کھانا کھاتے اور سونے سے قبل کچھ دیر ان سے باتیں کرلیا کرتے، اوراپنا کام خود کرلیتے اوراپنی بیویوں کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک فرماتے، اِسی وجہ سے اللہ تعالی نے فرمایا " لقد كان لكم فى رسول الله أُسوة حسنة " (الاحزاب 21) یعنی نبی کریم ﷺ میں تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے۔

۵۔رشتوں کے معاملہ میں مشورہ :

شر پسند عناصر اور فرقہ پرست طاقتیں لو جہاد کے نام سے ہندو لڑکوں کی شادیاں مسلم لڑکیوں کے ساتھ اور مسلم لڑکیوں کی شادیاں ہندو لڑکوں کے ساتھ کرارہی ہیں، دوسری طرف تعلیم یافتہ نئی نسل اپنی پسند کی شادی کے لئے مکمل آزادی چاہتے ہوئے اپنی پسند کے رشتے

کو ترجیح دیتے ہیں، بعض اوقات وہ والدین کی مرضی اور ان کے مشورہ کو بالکل ہی نظر انداز کر دیتے ہیں، دوسری طرف بعض والدین بچوں کے لئے ایسے رشتوں کا انتخاب کرتے ہیں، جو خود ان کے انتخاب کے بالکل ہی برخلاف ہوتے ہیں، اس سلسلے میں صحیح رویہ کیا ہے؟ کیا شرعاً رشتہ نکاح کے معاملے میں لڑکوں اور لڑکیوں کو ان کے والدین کی مرضی قبول کرنا واجب ہے؟ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو کیا وہ گنہگار ہوں گے؟ اس سلسلہ میں اسلام ہمیں کیا رہنمائی کرتا ہے؟

حق بات یہ ہے کہ رشتوں کا معاملہ باہم مشورہ سے طے ہونا ضروری ہے، یعنی والدین اور سرپرست کی ذمہ داری ہے کہ وہ باہم مشورہ اور دوستانہ انداز سے رشتہ طے کریں، اسلام میں مشورہ کی بڑی اہمیت ہے، اسی اہمیت کے پیش نظر قرآنِ کریم میں ایک سورت کا نام بھی الشوری سے ہے، مشورہ سے بہت ساری باتیں واضح ہوتی ہیں، شریعت مطہرہ کی روشنی میں لڑکی کے نکاح کے لئے اولیاء کی سرپرستی کی خاص اہمیت ہے، خصوصا نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان کہ **لا نکاح الا بولی وشاھدی عدل (صحیح ابن حبان: ۵۰۷۵، الارواء: ۱۸۳۹) یعنی نکاح ولی کی سرپرستی اور اجازت نیز دو گواہوں کی گواہی کے ساتھ منعقد ہوگا**، بڑی اہمیت کے حامل کا، نبی کریم ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جو عورت ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کر لے اس کا نکاح باطل ہے، (سنن النسائی، ۵۳۹۴) نیز یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جو عورت ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کر لے ایسا نکاح باطل ہے، (سنن ترمذی، ۱۱۰۲۔حسن) مذکورہ حدیثوں کی روشنی میں ولی/سرپرست کی ایک خاص حیثیت ہے، عورت خود اپنا نکاح نہیں کر سکتی، یہی جمہور علماء کی رائے ہے۔

اسلام نے نکاح کے سلسلہ میں صحتِ نکاح کو باکرہ کی اجازت کے ساتھ موقوف رکھا ہے، جس نکاح میں لڑکی کی رضامندی شامل نہ ہو، اور وہ منکوحہ اس نکاح سے راضی نہ ہو تو نبی کریم ﷺ نے اس نکاح کو کالعدم قرار دیا ہے، (سنن ابوداؤد، ۲۱۰۱، صحیح)، باکرہ سے اجازت لینے اور اس کی خاموشی کو رضامندی پر محمول کرنے کا حکم دیا۔ (البخاری، ۶۹۷۱) اور شوہر دیدہ عورتوں کی اجازت کو ان کے زبان سے اقرار کرنے کو لازم کیا گیا، (سنن ابوداؤد، ۲۰۹۹۔صحیح) البتہ لڑکے اگر بالغ ہو جائیں تو والدین کی کفالت اور ذمہ داری شرعاً ختم ہو جاتی ہے، وہ اپنے معاملہ میں صحیح فیصلہ کا اختیار رکھتے ہیں، وہ بھی والدین کی اجازت اور ان سے مشورہ کرنے کے بعد صحیح رشتوں کا انتخاب کر سکتے ہیں، موجودہ ماحول میں لڑکیوں سے نکاح سے کچھ پہلے اجازت لی جاتی ہے، اور منظوری حاصل کی جاتی ہے جب کہ یہ اصولا درست نہیں ہے، صحیح بات تو یہ ہے کہ رشتہ طے ہونے کے وقت (منگنی سے قبل) ہی لڑکیوں کی رضامندی معلوم کی جائے، کسی پر زبردستی اپنی رائے مسلط نہ کی جائے ورنہ نتائج خطرناک ثابت ہوں گے۔

۶۔ والدین کی ذمہ داریاں:

گھر کا ماحول اسلامی ہو تو سارے خاندان کے لئے باعث خیر وبرکت ہوگا، نیز ماں باپ کی اہم ذمہ داری یہ ہے کہ بچوں کے خیالات اور ذہنیت کا مطالعہ کریں، صحیح تربیت کی طرف توجہ دیں، زندگی کے نشیب وفراز سے آگاہ کریں، درست راستوں کی نشاندہی کریں، برے دوستوں سے بچنے کی تلقین کرتے رہیں، نیز نکاح سے قبل والدین کو اپنے بچوں کی رضامندی کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا، اس لئے کہ زندگی کا طویل سفر انہیں طے کرنا ہے، کسی معقول عذر کی بنیاد پر نکاح کے معاملے میں لڑکے اور لڑکیاں ولو بالفرض والدین کی مرضی کے مطابق شادی نہ کریں تو وہ گنہگار نہیں ہوں گے۔ ایسی صورت میں جب اولیاء اور نکاح کرنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان تنازع اور اختلاف برپا ہو تو حاکم/جمعیت/جماعت/عدالت کی سرپرستی میں نکاح شرعی منعقد ہوگا، ارشاد نبوی ﷺ

ہے، وان اشتجروا فالسلطان ولی من لا ولی لہ(رواہ الخمسۃ الا النسائی وصححہ الالبانی) یعنی لوگ ولایت کے سلسلہ میں اختلاف کر بیٹھیں تو حاکم اس کا ولی ہوگا جس کا کوئی ولی نہ ہو۔ ولو بالفرض باپ یا ولی کسی بے دین، بدعتی، بداخلاق، قادیانی وغیرہ سے نکاح کرانے پر مصر ہو اور لڑکے یا لڑکیاں اس رشتہ سے انکاری ہوں تو مذکورہ صورت حال میں کسی ثالث کے ذریعہ اس کے دینی نقصانات کے بارے میں سمجھانے کی کوشش کی جائے تاکہ وہ اپنے خیالات سے رجوع کرلے۔ اگر ولی اپنے خیالات پر مصر ہو۔

۷۔ حقوق زوجین:

اسلام میاں بیوی کو ایک دوسرے کا حق زوجیت ادا کرنے کا حکم دیتا ہے حقوق کی ادائیگی سے گھریلو زندگی میں امن وسکون بحال ہوگا اور اسلامی معاشرہ روبہ اصلاح ہوگا، نیز خاندانی نظام مضبوط ومستحکم ہوگا، نیز حقوق میں کوتاہی کے سبب یا افراط وتفریط کی وجہ سے معاشرتی زندگی میں بگاڑ پیدا ہوسکتا ہے، نکاح کے بعد حقوق العباد کے معاملہ میں محتاط ہونے کی ضرورت پڑتی ہے، بیوی کے حقوق ادا کرتے کرتے والدین اور دیگر رشتوں کا حقوق ہرگز پامال نہ ہونے پائے، حقوق کے معاملہ میں عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا ضروری ہے، نکاح سے قبل زوجین یعنی ہر مرد وعورت کو مندرجہ ذیل حقوق سے واقف ہونا ضروری ہے تاکہ ازدواجی زندگی میں حقوق کی ادائیگی کے ساتھ خوشگوار ماحول پیدا ہو اور ایک خوشگوار خاندان کا وجود برپا ہو۔

شوہر پر بیوی کے حقوق:

اللہ رب العالمین کا فرمان ہے وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (البقرۃ:۲۲۸) عورتوں کے لئے حقوق ہیں جس طرح ان پر حقوق ہیں۔

۱۔ گفتار وکردار میں حسن اخلاق: آپ ﷺ نے شوہروں سے فرمایا تم میں سب سے اچھے وہ لوگ ہیں جو اپنی بیوی کے حق میں سب سے اچھے ہوں (ترمذی)

۲۔ بود وباش میں اچھا سلوک: ارشاد نبوی ﷺ جب تم کھاؤ تو اسے کھلاؤ لباس پہنو تو اسے بھی پہناؤ، منہ پر نہ مارو، بددعا نہ دو، اپنے گھر کے سوا اس سے الگ نہ رہو۔ (احمد، ابوداؤد)

۳۔ نان ونفقہ کی ذمہ داری: ارشاد ربانی ہے وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ اور بچے کے باپ پر ان ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق واجب ہے (بقرۃ:۲۳۳)۔

۴۔ حق مہر: ارشاد ربانی ہے ''وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً (النساء:۴) یعنی تم ان عورتوں کا حق مہر ادا کردو۔

۵۔ حق وراثت: سورہ نساء آیت نمبر ۱۱ اور ۱۷ میں اس کی تفصیلات وارد ہیں۔

۶۔ نبی کریم ﷺ کی خاص وصیت: ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت قبول کرو اس لئے کہ عورت کی پیدائش پسلی سے ہوئی ہے اور سب سے ٹیڑھا حصہ اس کا بالائی حصہ ہے اگر تم اسے سیدھا کرنا چاہو گے تو اسے توڑ بیٹھو گے اور اگر تم اسے چھوڑ دو گے تو وہ ٹیڑھا ہی رہے گا (فطری کجی دور نہ ہوگی) اس کے ساتھ بھلائی کرتے رہو (مسلم)

۷۔ بیوی کے لئے زیب وزینت: عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں اپنی بیوی کے لئے زیب وزینت اختیار کرتا ہوں جس طرح وہ میرے لئے زیب وزینت اختیار کرتی ہے (تفسیر ابن جریر ۲/۴۵۳)

۸۔ عورت کی بری عادت کو برداشت کرنا: ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ کوئی مسلمان کسی مسلمان عورت سے بغض نہ رکھے اگر

اس کی کسی خصلت سے ناراض ہوتو اس کی کسی اور خصلت سے راضی ہوجائے۔(آداب الزفاف للألبانی ۱۹۹)

۹۔ عورت کی شرافت وکرامت کی حفاظت: ارشادنبوی ﷺ ہے کہ مرد اپنے گھر والوں کا محافظ ہے،اس سے اپنے ماتحتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا(بخاری مسلم)

۱۰۔ دینی معلومات کی تبلیغ: ارشادربانی ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا" (التحریم:٦) ترجمہ: اے مومنو!تم اپنے آپ کواوراپنے گھر والوں کوجہنم سے بچاؤ۔

۱۱۔ نماز کاحکم دینا: ارشادالٰہی ہے "وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَیْهَا" (طہ۱۳۲) یعنی تم اپنے گھر والوں کو نماز کاحکم دواورتم بھی اس کی پابندی کرو۔

۱۲۔ امورخیر میں عورتوں سے مشورہ لینا: جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے مشورہ سے صلح حدیبیہ کے موقع پراونٹ کونحر(ذبح) کیااورسرمونڈھ کرحلال ہوگئے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے بھی نبی کریم ﷺ کی اقتداء کی اور نافرمانی سے بچ گئے۔

۱۳۔ بلاضرورت عشاء کے بعدگھر سے باہر رہنا ممنوع ہے: نبی کریم ﷺ نے عبداللہ بن عمرورضی اللہ عنہ سے رات بھر جاگنے اور بیوی سے الگ تھلگ رہنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا بیشک تم پر تمہاری بیوی کاحق ہے(بخاری مسلم)۔

۱۴۔ سوکنوں کے درمیان عدل وانصاف: سوکنوں کے مابین نان ونفقہ پوشاک رہن سہن اورحق مباشرت میں انصاف کی اشدضرورت ہے جیسا کہ ارشادنبوی ﷺ ہے: جس کی دو بیویاں ہوں اوروہ ان میں سے کسی ایک کی طرف مائل ہوتا ہوتو وہ شخص قیامت کے دن اس طرح آئے گا کہ اس کا ایک بازو جھکا ہواہوگا۔ (ابن ماجہ،۱۶۰۳)

بیوی پر شوہر کے حقوق:

بیوی پرشوہر کے حقوق کااندازہ اس حدیث رسول سے ہوتا ہے جسے امام حاکم وغیرہ نے ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے، بیوی پر شوہر کا حق یہ ہے کہ اگر اسے کوئی ایسا پھوڑا لاحق ہو جو پیپ سے بھراہوا ہو بیوی اسے چاٹ لے تو پھر بھی اس نے اس کا حق ادانہیں کیا۔(صحیح ابن ماجہ۳۱۴۸،صحیح الجامع ۳۱۴۸)

۱۔ بھلائی کے امور میں شوہر کی اطاعت: ارشادربانی ہے "فالصالحات قانتات" (النساء۳۴) نیک بیویاں اطاعت گزار ہوتی ہیں۔

۲۔ شوہر کی رضاجوئی: ارشادنبوی ﷺ ہے جس عورت نے اس حال میں انتقال کیا کہ اس کا شوہر اس سے راضی تھا تو وہ جنت میں داخل ہوگی۔ (ترمذی)

۳۔ عزت وآبرو کی حفاظت: ارشادنبوی ﷺ ہے جو عورت پانچ وقت کی نماز پڑھے اور ماہ رمضان کے روزے رکھے، اپنی عزت وآبرو کی حفاظت کرے اورشوہر کی فرمانبرداری کرے تو اسے کہا جائے گا کہ تو جنت کے جس دروازے سے چاہے داخل ہوجا۔(احمد،صحیح الجامع ٦٦٠)

۴۔ بچوں کی تربیت اور شوہر کے جان ومال کی نگہبانی: ارشادنبوی ﷺ ہے: عورت اپنے شوہر کے گھر میں ذمہ دار اور نگراں ہے اس کی ذمہ داری کی ادائیگی کے بارے میں اس سے سوال کیا جائے گا۔(بخاری)

۵۔ آپس میں رازوں کی حفاظت: ارشادنبوی ﷺ ہے قیامت کے دن بدترین انسان وہ ہوگا جو اپنی بیوی کے پاس پہنچے اورعورت شوہر کی طرف پہنچے۔(خواہشات پوری کریں) پھر وہ اس کا بھید ظاہر کرے۔(مسلم)

۶۔ حق مباشرت: ارشادنبوی ﷺ ہے قسم اس ذات کی

جس کے قبضہ میں میری جان ہے شوہر اگر اپنی بیوی کو مباشرت کی دعوت دے اور وہ انکار کرے تو اللہ تعالی اس پر ناراض ہوجاتا ہے یہاں تک کہ شوہر اپنی بیوی سے راضی ہوجائے۔ (صحیح الجامع: ۷۰۸۰)

۷۔ شوہر کے لئے زیب وزینت اور خندہ پیشانی سے استقبال : ارشادنبوی ﷺ ہے عورتوں میں بہترین عورت وہ ہے جب تم اسے دیکھو تو خوش کردے اور حکم دو تو اطاعت کرے اور تمہاری غیر حاضری میں اپنی عزت وناموس اور تمہارے مال کی حفاظت کرے۔(صحیح الجامع:۳۲۹۹)

۸۔ شوہر کی اجازت کے بغیر باہر نہ نکلنا: ارشادربانی ہے ''وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُن'' (الاحزاب:۳۳) یعنی تم اپنے گھروں کو لازم پکڑو۔

۹۔ شوہر کی اجازت کے ساتھ کسی کو گھر میں داخلہ کی اجازت : ارشادنبوی ﷺ ہے تمہارا ان پر یہ حق بنتا ہے کہ وہ لوگ تمہارے بستروں کو پامال نہ کریں جنہیں تم ناپسند کرتے ہو اور ان کو اپنے گھروں میں داخلہ کی اجازت نہ دیں جنہیں تم ناپسند کرتے ہو (صحیح ابن ماجہ ۱/ ۳۱۱ ترمذی، حسن ۵/۲۷۳)

۱۰۔ شوہر کی اجازت کے بغیر اس کا مال اور اپنا مال خرچ نہ کرے : ارشادنبوی ﷺ ہے کوئی عورت کوئی چیز شوہر کی اجازت کے بغیر خرچ نہ کرے۔ (ابن ماجہ ۱۸۵۹ صحیح) دوسری روایت میں ارشادنبوی ہے عورت کیلئے حق نہیں ہے کہ وہ اپنا مال شوہر کی اجازت کے بغیر خرچ کرے (السلسلۃ الصحیحۃ :۵۷۷)

۱۱۔ شوہر کی موجودگی میں بلا اجازت نفل روزہ نہ رکھے: نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے بیوی کے حق میں جائز نہیں ہے کہ شوہر کی موجودگی میں نفل روزہ رکھے مگر اس کی اجازت سے۔ (السلسلۃ الصحیحۃ:۵۷۷)۔

۱۲۔ قناعت کی دولت سے مالا مال ہونا : ارشادربانی ہے ''لِیُنْفِقْ ذُوْسَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَیْهِ رِزْقُهٗ فَلْیُنْفِقْ مِمَّا اٰتٰىهُ اللّٰهُ لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَاسَیَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ یُّسْرًا'' (الطلاق: ۷) ترجمہ:صاحب حیثیت اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کرے اور جو تنگ دست ہو تو اسی میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا ہے اللہ کسی کو تکلیف نہیں دیتا مگر اسی کے مطابق جو اس نے اسے دیا ہے۔عنقریب اللہ تنگی کے بعد آسانی دے گا۔

۱۳۔ بلاسبب شرعی طلاق کا مطالبہ حرام ہے : ثوبانؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو عورت اپنے شوہر سے بلا سبب شرعی طلاق کا مطالبہ کرتی ہے اس پر جنت کی خوشبو بھی حرام ہے۔ (الارواء : ۲۰۳۵ ۔صحیح) دوسری روایت میں ارشاد نبوی ﷺ ہے خلع لینے والیاں وہی منافقات ہیں۔ (صحیح الارواء ،۶۶۸۱) طلاق کے واقعات میں بہت سی دفعہ والدین کا اصرار بھی شامل ہوتا ہے، تو کیا ماں باپ کے لئے یہ بات جائز ہے کہ وہ بہو کو ناپسند کرنے کی وجہ سے بیٹے کو مجبور کریں کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے، اور کیا بیٹے پر اپنے ماں باپ کی اس بات کو ماننا ضروری ہے؟

مذکورہ حالت میں والدین کی اطاعت کی بھی شرعی حدود ہیں، یعنی خالق کی اطاعت ہر حال میں واجب التقدیم ، اللہ کی نافرمانی کے ساتھ کسی بھی مخلوق کی اطاعت واجب نہیں ہے، البتہ والدین کی اطاعت اس وقت واجب ہے جب کہ دینی نقطہ نظر سے طلاق دینا ہی مصلحت کا متقاضی ہو، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے اپنے فرزند عبداللہ سے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا مطالبہ کیا تھا، تو انہوں نے انکار کیا، وہ اپنی بیوی کو بہت چاہتے تھے، آخر کار معاملہ نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچا تو آپ نے ابن عمرؓ سے فرمایا کہ باپ کی اطاعت کرو اور اسے

طلاق دیدو، (مسند احمد، ۴۷۱۱) نیز اسی طرح کا واقعہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور آپ کے فرزند عبدالرحمٰن بن ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ بھی پیش آیا تھا، (اسلام ویب، رقم الفتوی، ۳۵۷۴۹) الغرض دینی نقطہ نظر سے والدین اپنی اولاد سے طلاق دینے کا مطالبہ کریں تو اس صورت میں ان کی اطاعت واجب ہوگی ورنہ نہیں۔

نیز بعض خاص مجبوریوں میں طلاق دینا یا عورتوں کا طلاق کا مطالبہ جائز اور درست ہے، مختصر الفاظ میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جب زوجین کے مابین نباہ کی کوئی صورت باقی نہ رہے، صلح کی ساری صورتیں کارگر ثابت نہ ہوں تو ایسی صورت میں طلاق کی شرعا اجازت ہوگی، لیکن اہل علم نے طلاق کے بعض مخصوص اسباب بھی بیان کئے ہیں، جن کی وجہ سے طلاق دینا جائز ہے، ان میں سے بعض کا تذکرہ درج ذیل سطروں میں کیا جارہا ہے۔

اصولا کسی عورت کو کسی سبب شرعی/ عذر شرعی کے بغیر اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ ایسی عورتوں کے لئے جنت کی خوشبو بھی حرام کردی جائے گی، (سنن ابوداؤد، سنن ترمذی، صححہ الالبانی) بعض خاص حالات میں عورت کے لئے طلاق کا مطالبہ جائز ہوتا ہے مثلا:

۱۔ جب شوہر حقِ زوجیت، نان ونفقہ، حسن معاشرت، حق مباشرت، قیام وطعام کا صحیح انتظام کرنے سے قاصر ہو، اس صورت میں صاحب المغنی ابن قدامہؒ نے فرمایا کہ عورت کو اختیار دیا جائے گا کہ وہ یا تو صبر کرے یا جدائی کا راستہ اپنائے۔

۲۔ بیوی کی توہین کی جائے، بلاضرورت شرعی اس کی پٹائی ہو، یا اس پر لعن طعن کا معاملہ کیا گیا ہو۔

۳۔ شوہر خرچ کے معاملہ میں بخیلی سے کام لیتا ہو، اس کا پورا حق نہ ادا کرتا ہو تو بیوی طلاق کا مطالبہ کرسکتی ہے۔

۴۔ شوہر چھ ماہ سے زیادہ غائب ہو، خواہ سفر پر ہو یا قیدی بن کر طویل مدت محبوس ہو، بیوی کو فتنہ کا شدید اندیشہ ہو، غلط راستہ سے بچنے کی صورت نہ ہو تو طلاق حاصل کرکے پاکدامنی کی صورت اپنائے۔

۵۔ جب شوہر میں بانجھ پن ہو، (جنسی کمزوری) یا حق مباشرت سے قاصر ہو، یا کسی خطرناک مرض سے دوچار ہو تو ایسی صورت میں بھی بیوی کو اختیار ہوگا۔

۶۔ اگر بیوی اپنے دل میں شوہر کے خلاف سخت نفرت یا بغض محسوس کرے تو الشیخ ابن جبرین حفظہ اللہ نے فرمایا کہ شوہر کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ خود آگے بڑھ کر طلاق دیدے۔

۷۔ جب شوہر منشیات کا عادی ہو، تو بقول الشیخ ابن عثیمینؒ ایسے شوہر سے طلاق کا مطالبہ جائز ہے۔

نیز بعض وہ اسباب بھی ہیں جن کی وجہ سے شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دیدے، مثلا عورت بدچلن ہو، اپنے شوہر سے خیانت کر بیٹھے، یا بدزبان ہو، یا بانجھ ہو، بداخلاق ہو، حق زوجیت ادا کرنے سے قاصر ہو، شادی سے قبل دائم المرض سے دوچار ہو، اور شوہر کو لاعلمی میں رکھ کر نکاح کیا گیا ہو، مطلب یہ ہے کہ یہ اور اس طرح کے اسباب خاندان کے استحکام میں رکاوٹ بنتے ہیں، بسا اوقات برے نتائج سامنے آتے ہیں، ہمیں ان مذکورہ اسباب سے دور رہنا ہوگا، الفت ومحبت پیدا کرنے والے اسباب کو اپنا کر گھر کے ماحول کو خوشگوار بنانے کی اللہ تعالی ہمیں توفیق نصیب فرمائے، اللهم الف بين قلوبنا واصلح ذات بيننا واهدنا سبل السلام، برحمتك يا ارحم الراحمين. آمين يارب العالمين.

☆☆☆

❑ فقہی مباحث

ہاتھ یا سر کے اشارے سے سلام کرنا- ایک فقہی بحث

محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی، استاذ دارالعلوم حیدرآباد
Email:mtalam800@gmail.com

حدیث میں ہے: تسليم اليهود، الإشارة بالأصابع، وتسليم النصارىٰ، الإشارة بالأكف، یعنی یہودیوں کا سلام کرنا، انگلیوں کے ذریعہ اشارہ کرنے اور عیسائیوں کا ہتھیلیوں کے ذریعہ اشارہ کرنے کی صورت میں ہوتا ہے۔(ترمذی: ۲۶۹۵، کراھیۃ إشارۃ الید)

حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا:

لا تُسلموا تسليم اليهود، فإن تسليمهم بالرؤوس والأكف والإشارة، یہودیوں کی طرح سلام نہ کرو، اُن کا سلام سر، ہاتھ اور اشارے سے ہوتا ہے۔(عمل الیوم واللیلۃ للنسائی، رقم: ۳۴۰)

ایک دوسری روایت میں ہے:

تسليم الرجل بأصبع واحدةٍ يُشير بها، فعلُ اليهود، کہ آدمی کا اشارہ کرکے ایک انگلی سے سلام کرنا، یہودی فعل ہے۔(الترھیب: ۴۳۵/۳)

شارحینِ حدیث نے اِن جیسی احادیث سے یہ مسئلہ ثابت کیا ہے: کہ سر، ہاتھ یا جسم کے دوسرے اعضاء سے اشارہ کرکے، الفاظ بولے بغیر سلام کرنا یا جواب دینا جائز نہیں؛ بلکہ یہودیوں اور متکبّر لوگوں کا کام ہے۔

مظاہر حق جدید میں ہے:

چناں چہ آں حضرتﷺ کو، گویا مُکاشفہ ہوا کہ میری امت کے کچھ لوگ بے راہ روی کا شکار ہوکر، سلام کرنے کا وہ طریقہ اختیار کریں گے، جو یہودیوں، عیسائیوں اور دوسری غیر اقوام کا ہے جیسے انگلیوں یا ہتھیلیوں کے ذریعہ اشارہ کرنا، ہاتھ جوڑ لینا، کمر یا سر کو جھکانا اور صرف سلام کرنے پر اکتفا کر لینا وغیرہ وغیرہ؛ لہٰذا آپﷺ نے پوری امت کو مخاطب کرتے ہوئے، اِس بارے میں تنبیہ بیان فرمائی اور یہ وعید بیان کی کہ جو شخص سلام کے اِن رسم ورواج کو اپنائے گا جو اسلامی شریعت اور ہماری سنت کے خلاف ہیں، تو اُس کو سمجھ لینا چاہیے کہ اُس کا شمار، ہماری امت کے لوگوں میں نہیں ہوگا۔(مظاہر حق: ۳۴۷/۵)

حدیث کا ضُعف اور اس کا جواب:

اوپر سنن ترمذی کی جو روایت ذکر کی گئی ہے، اُس کے بارے میں امام ترمذیؒ نے کہا ہے: إسناده ضعيف کہ اس حدیث کی سند ضعیف ہے، یعنی قابلِ استدلال نہیں؛ لہٰذا محض اشارے سے سلام کے عدمِ جواز پر استدلال درست نہیں، ملا علی قاریؒ نے اِس کا جواب دیا ہے: کہ محض کسی حدیث کے ضعیف ہونے کی وجہ سے حکم بھی بدل جائے یہ ضروری نہیں ہے؛ نیز یہ حدیث دوسری صحیح سند سے مروی ہے مثلاً: عمل الیوم واللیلہ والی روایت، حافظ ابن حجرؒ نے کہا ہے: وسنده جيد.(فتح الباری: ۱۹/۱۱)

علاوہ ازیں صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ سلام باللفظ مسنون ہے اور اسی طرح اُس کا جواب بھی زبان سے دینا واجب ہے؛ لہٰذا

محض اِس حدیث کے ضعیف ہونے کی وجہ سے اشارے سے سلام کے عدمِ جواز کا حکم نہیں بدلے گا۔(مرقاۃ:۹/۵۷)

تعارُض اور اُس کا حل:

محض اشاروں سے سلام کے جواز کے سلسلے میں حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا کی ایک روایت پیش کی جاسکتی ہے کہ حضورﷺ ایک روز مسجد سے گذرے اور وہاں عورتوں کی ایک جماعت (دینی تعلیم کے حصول کے لیے) موجود تھی، تو آں جناب نے اپنے ہاتھ کے اشارہ سے سلام کیا اور امام ترمذیؒ نے اِس حدیث کے بارے میں "هذا حديث حسنٌ" کہا ہے۔

علامہ نوویؒ نے اِس حدیث کے بارے میں کہا ہے: کہ اِس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حضورﷺ نے لفظ، اشارہ دونوں کو جمع کیا تھا، صرف اشارے سے سلام نہیں کیا تھا، اور اِس کی تائید اِس سے ہوتی ہے کہ ابوداؤدؒ نے بھی اِس روایت کو نقل کیا ہے اور اُس میں فأهوى بيده (اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا) کے بعد فَسَلّم علينا کے الفاظ زائد ہیں، اگر صرف ہاتھ سے اشارہ کیا تھا تو فَسَلَّم علينا کا کوئی مطلب نہیں رہ جاتا۔(فتح الباری:۱۱/۱۸، مرقاۃ:۹/۵۷)

ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں: کہ اگر مان لیا جائے کہ حضورﷺ نے زبان سے نہیں؛ بلکہ محض اشارے سے سلام کیا تھا، تب بھی مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا؛ کیوں کہ یہ آپ کی خصوصیات میں سے ہے؛ لہٰذا آپ کو سلام کرنے، نہ کرنے اور اشارہ سے سلام کرنے نہ کرنے؛ ہر طرح کا اختیار ہے، ثانیاً کبھی اشارہ سے بغیر سلام کے قصد کے، محض تواضُع کو مراد لیا جاتا ہے، ثالثاً اشارہ سے سلام کرنا، عورتوں کے حوالے سے، بیانِ جواز پر محمول ہے، مَردوں کا یہ مسلہ نہیں ہے۔(مرقاۃ المفاتیح:۹/۵۷)

فائدہ: ملا علی قاریؒ نے مذکورہ حدیث کی جو تاویلات پیش کی ہیں، اُن سے اُن ساری روایتوں کا جواب بن جاتا ہے، جس میں کچھ صحابہ کرام کا اشارے سے سلام کرنا مروی ہے، ایسی روایات کے لیے دیکھیے امام بخاریؒ کی الأدب المفرد (باب من سلم إشارة) لیکن امام بخاریؒ نے ایسی روایتوں کو ذکر کرنے کے بعد آخری روایت عطا بن ابی رباحؒ کی نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں: كانوا يكرهون التسليمَ باليد، وقال: كان يكره التسليم باليد (الأدب المفرد: رقم:۹۴۰)

یعنی اکثر صحابۂ کرامؓ ہاتھ کے اشارے سے سلام کرنے کو ناپسند کرتے تھے، اور خود حضرت عطا بھی اِسے ناپسند کرتے تھے۔

راقم عرض گزار ہے کہ امام بخاریؒ نے اس آخری روایت سے اِس جانب اشارہ کیا ہے: کہ محض ہاتھوں کے اشارہ سے سلام، کچھ صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے؛ لیکن اکثر صحابہ کرامؓ زبان سے سلام کرتے تھے اور یہی معمول بہا ہے۔

چند مسائل:

مسئلہ: سلام کے ساتھ ہاتھ اٹھانے کی بھی گنجائش ہے؛ اگر چہ ضرورت نہیں۔(محمودیہ:۹/۷۳)

مسئلہ: لفظ اور اشارہ کا جمع کر لینا جیسا کہ ہمارے بلاد میں معمول ہے، اگر چہ اولی نہ ہو؛ مگر جائز ہے؛ خصوصاً جب کہ یہ اشارہ علامتِ تعظیم وتوقیر، عرفاً قرار پا چکا ہے۔(فتاوی رحیمیہ:۱۰/۱۳۱)

مسئلہ: قرآن مجید میں ہے کہ جب تم کو کوئی سلام کرے تو اُس سے اچھا جواب دو یا ویسا ہی لوٹا دو، اِس سے معلوم ہوا کہ سلام کے جواب میں سر ہلا دینا یا ہاتھ اٹھا دینا کافی نہیں۔(فروع الایمان مع اصلاحی نصاب:۴۲۱)

معلوم ہوا کہ سلام کے موقع پر صرف ہاتھ اٹھا دینا کافی نہیں ہے، شہر حیدرآباد میں، دیکھا جاتا ہے کہ سلام کرنے والا، سلام کرتے وقت، اپنا ہاتھ مخصوص انداز میں اپنے چہرے یا سینہ تک لے جاتا ہے اور بعض لوگ ہاتھ کو حرکت بھی دیتے ہیں، یہ طریقہ، اسلامی طریقہ نہیں ہے، اور جواب دینے والا بھی بعض دفعہ ایسے ہی کرتا

ہے، یہ بھی زائد چیز ہے۔

مسئلہ: جب بُعد (دوری) یا کسی اور وجہ سے آوازِ سلام سمجھ میں نہ آسکے تو ہاتھ سے اِعلام واِعلان مباح ہے۔(فتاوی رحیمیہ:۱۳۱/۱۰)

یعنی عام حالات میں صرف ہاتھ سے یا سر سے سلام کرنا جائز نہیں؛ بلکہ مجبوری کی حالت میں ہاتھ سے اشارہ کرسکتا ہے؛ لیکن لفظِ سلام اور جواب سلام کے الفاظ اور اشارہ دونوں کو جمع کرے، اور گونگے کا مسئلہ الگ ہے وہ ہاتھ کے اشارے سے ہی سلام یا سلام کا جواب دے گا، اُس کے حق میں، اِشارہ تلفظ کے درجہ میں ہے۔سلام کے جواب میں صرف سر ہلانا، بدمذاقی ہے۔

حضرت تھانویؒ کے مواعظ میں ہے:

بعض لوگ جو سلام کے جواب میں، سر ہلاتے ہیں اور زبان سے ''وعلیکم السلام'' نہیں کہتے ہیں وہ بدمذاق ہیں کہ ٹکاسی زبان نہیں ہلاتے اور دھڑ اسا سر ہلادیتے ہیں، ممکن ہے کوئی معقولی اِس کی توجیہ کرے کہ فعل بسیط، فعل مرکب سے آسان ہوتا ہے اور سر کا ہلانا اضافہ اور فعل بسیط ہے، اور زبان کا چلانا فعل مرکب ہے؛ کیوں کہ الفاظ کو مخارج سے خاص ہیئت وترکیب کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے۔

سو جواب اِس کا یہ ہے کہ اس لحاظ سے؛ اگرچہ سر ہلانا سہل ہے؛ مگر جس غرض سے سلام کرتے ہیں اُس غرض وغایت کے لحاظ سے زبان ہی کا فعل آسان ہے؛ کیوں کہ سر ہلانے سے وہ غرض حاصل نہیں ہوتی، سلام سے مقصود دعا ہے اور وہ بدونِ کلام وتکلم کے حاصل نہیں ہوتی تو جو لوگ سلام وجوابِ سلام میں سر ہلاتے ہیں ان کو غایات ومقاصد سے دلچسپی نہیں اور یہی بد مذاقی کی علامت ہے۔ (خطبات حکیم الامت:۱۲۳/۲۸،اصلاح ظاہر)

سلام اور جوابِ سلام میں جھر اور سنانا ضروری ھے : سلام چاہے ابتداءً ہو یا جواباً ہو: بہرحال ایک دوسرے کو سنانا ضروری ہے، بغیر سنائے نہ تو سلام، سلام ہوگا اور نہ ہی جواب، جواب ہوگا، سلام ایک مبارک اور پاکیزہ تحفہ ہے، جہر کے بغیر اِس کا مقصد حاصل نہیں ہوگا، حضورﷺ اور صحابۂ کرام کا یہی معمول تھا کہ سلام اور جوابِ سلام میں جہر کرتے تھے؛ لیکن یہ بلند آواز معتدل ہو، آواز اِتنی تیز نہ ہو کہ سننے والے کو دِقّت اور تنگی محسوس ہو اور نہ ہی آواز اتنی پست ہو کہ سلام کرنے والے یا سننے والے سن ہی نہ سکیں۔

دلائل: حافظ ابن حجرؒ نے حضورﷺ کے ارشاد أفشوا السلام بينكم (اپنے درمیان سلام کو رواج دو) کی شرح میں لکھا ہے:

١ – الإفشاء، الإظهار والمراد نَشْرُ السلام بين الناس؛ ليُحْيُوا سنته.

افشاء، اظہار کو کہتے ہیں: اور مقصد اِس سے لوگوں کے درمیان سلام کو پھیلانا ہے؛ تاکہ لوگ آپ کی سنت کو زندہ کریں۔(فتح الباری:۲۰/۱۱)

٢ – علامہ نوویؒ کے حوالے سے علامہ عینیؒ نے لکھا ہے:

وأقل السلام ابتداءً ورداً أن يُسمِعَ صاحبه، ولا يجزئه دون ذلك.

سلام اور جوابِ سلام میں کم از کم درجہ یہ ہے کہ مُتعلّقہ شخص کو سنایا جائے، اور اس سے کم سلام کافی نہیں۔(عمدۃ القاری:۳۴۶/۱۵)

علامہ قرطبیؒ لکھتے ہیں:

٣ – فكذلك إذا أجاب بجوابٍ لم يُسمَعْ منه، فليس بجوابٍ. اگر کوئی جواب دے اور سنائے نہ، تو وہ جوابِ سلام نہیں ہے۔(الجامع لأحکام القرآن:۳۰۳/۵)

ایک شبہ اور اس کا جواب:

سوال: سلام کا جواب اگر آہستہ دیا کہ مسلّم نے نہ سنا، تو جواب ادا ہوگا یا اِسماع بھی ضروری ہے، بعض صحابہؓ نے آں حضرتﷺ کے سلام کا جواب نہایت آہستہ سے دیا کہ بوجہ عدم سماع، تکرارِ سلام کی نوبت آئی، آخر حضور واپس ہوئے تھے؛ گو علت یہاں استماعِ

کلام وتحصیل برکت ہے، مگر بظاہر شبہ جواز کا معلوم ہوتا ہے۔

الجواب: اِعلام ضروری ہے، اگر قریب ہو تو اِسماع سے اور اگر بعید یا اَصَمّ (بہرہ) ہو تو اشارہ سے مع تلفُّظ بلسان کے اور صحابی کا یہ فعل عارض سے تھا فلا یقاس علیہ غیرہ. (امداد الفتاوی:۴/۲۷۶)

ایک مبنی بر حکمت رائے:

مفتی محمد تقی عثمانی زید مجدہ لکھتے ہیں: میں نے حضرت تھانویؒ کی کسی کتاب میں دیکھا تھا، کہ سلام کا جواب دینا واجب تو ہے؛ لیکن جواب کو سنانا مستحب ہے؛ کیوں کہ ایسی صورت اُس شخص کے لیے ہے جو جواب سنانے سے عاجز ہو یا جواب سنانا مشکل ہو تو اُسے ترکِ واجب کا گناہ نہ ہو، اُس کے لیے آسانی رہے گی؛ لیکن یہ بات فقہاء کی کتابوں میں مجھے نہیں ملی۔

قال العبد الضعيف عفا الله عنه:

وقد رأيت في بعض كتب شيخ مشائخنا الإمام محمد أشرف علي التهانوي رحمه الله تعالى أن رد السلام واجب، وإسماعه مستحب وفيه سعة لمن يشكل عليه الإسماع، ولكني لم أجده في كتب الفقهاء القدامى. (تکملہ:۴/۲۴۵)

سلام کرنے کا لب ولہجہ اور انداز:

حضرت تھانویؒ کے افادات بنام ''اسلامی تہذیب'' میں ہے:

۱- شریعت نے صیغۂ سلام یعنی السلام علیکم کے لفظ میں چھوٹے بڑے میں کچھ تفریق وتفصیل نہیں رکھی، ہاں لہجہ میں فرق ہونا چاہیے؛ کیوں کہ یہ عظمت وادب میں داخل ہے، جس کی شریعت میں تعلیم ہے۔

۲- چھوٹے بڑوں کو نیازمندی کے لہجہ میں سلام کریں اور بڑے اُن کو حقیر نہ سمجھیں۔

۳- باپ کو بیٹا ایسے لہجہ میں سلام کرے کہ سلام کے لہجہ سے معلوم ہو جائے کہ سلام کرنے والا بیٹا ہے، اِس میں کون سے حرج اور کون سی تحقیر کی بات ہے۔

۴- بعض لوگ کچھ ایسی ادا سے اور ایسے لب ولہجہ سے سلام کرتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا محبت ٹپکی پڑتی ہے، (یعنی ایسا ہونا چاہیے) بعض اوقات کسی کے فقط سلام کرنے سے عمر بھر کے لیے محبت ہوگئی۔ (اسلامی تہذیب:۵۸)

گونگے کا سلام اور جواب سلام:

(۱) اگر کسی نے گونگے کو سلام کیا تو وہ اشارے سے جواب دے دے، فرض ساقط ہو جائے گا۔ (عمدۃ القاری:۱۵/۳۴۶)

(۲) اگر گونگے نے اشارے سے کسی کو سلام کیا تو اُسے جواب دینا چاہیے؛ کیوں کہ اشارہ گونگے کے حق میں بہت سے احکام میں تلفظ کے قائم مقام ہے۔ (ایضا)

بہرے کو سلام کرنا:

اگر کوئی ایسے شخص کو سلام کرے جو بہرہ ہے تو سلام کرنے والے کو چاہیے کہ تلفظ کے ساتھ ساتھ اشارہ بھی کرے؛ تاکہ وہ سمجھ جائے کہ مجھے سلام کیا جارہا ہے، ورنہ مستحقِ جواب نہیں ہوگا اور اگر بہرے نے کسی کو سلام کیا تو جواب میں تلفظ کے ساتھ ساتھ اشارہ بھی ضروری ہے۔ (ایضا)۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو سنت کے مطابق افشاء سلام کی توفیق عطا فرمائے۔

☆☆☆

❑ تعلیم و تربیت

تربیت اولاد- چند اہم گوشے

تلخیص وترجمانی
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

اخلاقی نشو ونما (۵ تا ۱۱ سال کی عمر کے درمیان: اخلاقی نشو ونما کے اعتبار سے ۵ تا ۱۱ سال کی عمر کا مرحلہ بہت اہم ہوتا ہے، صحیح وغلط اور حلال وحرام سے متعلق بچہ نے جو کچھ سیکھا ہوتا ہے وہ اس مرحلہ میں اس کے سامنے زیادہ واضح ہو جاتا ہے، پانچ سال کی عمر سے قبل بچے کے لئے وہی صحیح اور حلال ہوتا ہے جس کے کرنے کا والدین حکم دیں اور وہ حرام وغلط ہوتا ہے جس سے والدین روک دیں، لیکن پانچ سال کی عمر میں بچے کا ذہن وسیع ہونا شروع کرتا ہے، ساتھ ہی بچے کی بڑھتی ہوئی قوت تفکیر اور قوت فیصلہ بھی اپنا کام کرتی ہے، وہ حوادث، مواقف اور لوگوں کے سوالات پر پہلے سے زیادہ غور کرتا ہے، عمر کے اس مرحلہ میں وہ دوسروں کے سلسلہ میں رائے کا بھی اظہار کرنے لگتا ہے، مثلا اس مرحلہ سے پہلے جب بچے کو اس کے والد کسی کام کو کرنے سے منع کرتے تھے تو وہ ان سے بغیر یہ معلوم کیے کہ انھوں نے کیوں منع کیا غصہ ہو جایا کرتا تھا، وہ ہمیشہ یہ سمجھتا تھا کہ اس کے والد ہی کی رائے صحیح اور صائب ہے، لیکن اب وہ زندگی، کائنات اور لوگوں کو اپنے خاص زاویہ نظر سے دیکھنا شروع کر دیتا ہے، اس مرحلہ تک آتے آتے اس کی نفسیات یہ ہوتی تھیں کہ وہ لوگوں سے پذیرائی ملنے اور تعریف سننے کا مشتاق رہتا تھا کہ کوئی یوں کہہ دے کہ ''یہ اچھا لڑکا ہے'' اس مرحلہ میں یہ نفسیات اس قدر باقی نہیں رہتی، وہ اس کی اس قدر پروا نہیں کرتا، اب وہ یہ سمجھ چکا ہوتا ہے کہ اس کے پاس مستقل ایک عقل ہے جس سے وہ سوچتا ہے، خود اس کے پاس قوت فیصلہ ہے، اسی طرح اس کی خود مختاری اسے بڑوں سے سوال کرنے کی اجازت دیتی ہے، اسی لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۵ سے ۱۱ سال کی عمر کا مرحلہ اخلاقی نشو نما کے اعتبار سے تبدیلی و منتقلی کا مرحلہ ہے، خاص طور پر جب وہ اسکول میں داخل ہوتا ہے، تو اس کے سامنے مشکلات ہوتی ہیں اور مختلف قسم کے اخلاقی چیلنجز ہوتے ہیں، اس نے گھر میں یہ سیکھا ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے حقوق کا احترام کرے جس طرح دوسرے اس کی قدر کرتے ہیں اور اس کا احترام کرتے ہیں، وہ گھر میں سیکھ چکا ہوتا ہے کہ وہ کسی پر ظلم نہ کرے اور نہ ہی کسی کو اس پر ظلم کرنے کا حق ہے، جس طرح دوسروں کے حقوق ہیں اسی طرح اس کے بھی حقوق ہیں، لیکن اب جبکہ وہ اسکولی زندگی میں ہے، اور گھر کی زندگی سے باہر آیا تو وہ عملا اس مثالی اخلاق کا مشاہدہ نہیں کرتا جس سے اس کو گھر میں سابقہ پڑ رہا تھا، اب کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ مدرسہ کے ساتھی اس کو وہ احترام نہیں دیتے جس طرح وہ ان کا خیال رکھتا ہے، بسا اوقات کوئی بچہ اس کے ساتھ زیادتی بھی کرتا ہے، یا اس کی کوئی چیز لے لیتا ہے تو معلّمہ اس کی شکایت بھی نہیں سنتیں، وہ دیکھتا ہے کہ لوگوں کو جو بھلا لگتا ہے وہی وہ کرتے ہیں اور ان کی گرفت بھی نہیں کی جاتی، نہ کوئی ان کو تنبیہ کرتا ہے اور نہ سزا دیتا ہے، بلکہ بسا اوقات تو کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا اس نے گھر میں جو اخلاقی اور دینی اصول سیکھے تھے ان کے بالمقابل اب وہ یہ عجیب

اخلاقی طور طریقے دیکھتا ہے، اس کے کان میں ایسی باتیں اور ایسے کلمات بھی پڑتے ہیں جن کے بارے میں وہ تصور بھی نہیں کرسکتا کہ کوئی ایسی زبان استعمال بھی کرسکتا ہے، جیسے بسا اوقات بعض گرے ہوئے، گندے اور سوقیانہ الفاظ زبان سے نکالے جاتے ہیں، بسا اوقات اس کو لگتا ہے کہ وہ ان طور طریقوں کو قبول کرنے اور ان تبدیلیوں کو اپنانے پر مجبور ہے، کسی کسی وقت اس کو پریشان ہوکر ایسا لگتا ہے کہ اسے اپنے اخلاقی طور طریقے بدل دینا چاہیے۔

ایسے موقع پر یقیناً آپ اپنے بچے کو لے کر پریشان ہوں گے اور آپ کو پریشان ہونے کا حق بھی ہے، آپ یقیناً نہیں چاہیں گے کہ اس کی عادتیں بدلیں، وہ بدسلوکی اور انحراف پر آمادہ ہوجائے، لیکن کیا آپ اپنے بچے کو خارجی اثرات سے متاثر نہ ہونے سے روک سکتے ہیں؟، اصل میں بچے کو یہ سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ زندگی میں بسا اوقات ایسے موڑ آتے ہیں، ایسے حالات پیدا ہوتے ہیں جہاں انسان کو کچھ بولنے یا کرنے کے سلسلے میں ذاتی طور پر فیصلہ کرنا پڑتا ہے، اس کو سیکھنا چاہیے کہ حقیقی زندگی میں متعدد مرتبہ ظلم اور بدترین اقدامات سے سابقہ پڑتا ہے، بچے کو یہ سیکھنا چاہیے کہ ان تمام حالات میں وہ کیسے رہے اور کیسے برتے، بچہ ان مخالف ہواؤں کا مقابلہ کیسے کرے اور ان موجوں کو تیر کر کس طرح پار کرے تاکہ وہ کامیابی کے ساتھ ان حالات سے نمٹ سکے یہ ہے اصل بات، اس لیے بچے کو مشکلات سے نجات حاصل کرنے اور بچ کر نکل جانے کا ہنر آنا چاہیے، بالفاظ دیگر اسے تیراکی میں ماہر ہونا چاہیے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ:

۱۔ گھر میں بچے کے لیے امن ومحبت اور احترام کا خوشگوار اور مضبوط ماحول ہو۔

۲۔ افراد خانہ کے تعامل کے ذریعہ اس کو صحیح اور غلط کے متعلق مناسب شعور کا حامل بنایا جائے۔

۳۔ اس کو اچھی طرح یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے والدین ہمیشہ اس کی بات سننے کے لئے تیار رہتے ہیں اور جب بھی اس کو ضرورت ہو تو وہ اس کی مدد وتائید کے لیے آمادہ رہتے ہیں۔

اب کسی کے ذہن میں یہ سوال آسکتا ہے کہ بچہ کسی روز اسکول سے آئے اور لغو الفاظ کا استعمال کرے یا وہ دیگر بچوں کے ساتھ نا مناسب حرکت کرنے کا تذکرہ کرے، تو اس کو کیا کرنا چاہیے؟

مشاہدے کی بات یہ ہے کہ عام طور پر بچے اسکول میں اس طرح کی صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں اور بسا اوقات غیر مناسب امور میں ملوث ہوتے ہیں، لیکن واپس آکر یا تو شرمندگی یا پھر احساس گناہ کے باعث وہ اس کا تذکرہ نہیں کرتے، یا پھر وہ طفلانہ فخر کے باعث اس کا ذکر نہیں کرتے کہ وہ بھی دیگر بچوں کے ساتھ ان کی مہم میں شرکت کی قدرت رکھتے ہیں، اب اس موقع پر اگر بچے پر غصہ کیا گیا یا اس کو ڈرایا دھمکایا گیا تو اس کا مطلب کہ اس کو اس طرح کی چیزیں چھپانے پر آمادہ کیا گیا، گویا اس کو یہ احساس دلایا گیا کہ وہ گھر کے باہر جو کچھ کرے گھر میں آکر صراحت کے ساتھ اس کا تذکرہ نہ کرے، اس لیے کہ وہ سمجھ گیا کہ اگر وہ گھر میں آکر آپ کو اپنے کرتوتوں کی خبر دے گا تو آپ کا ردعمل سخت ہوگا جو اس کی مصیبت میں مزید اضافہ کرے گا اور اس کے لئے افسوس و تکلیف کا باعث ہوگا۔

ایسے موقع پر اس کے ساتھ بہتر تعامل کرنا چاہیے، جو کچھ بچہ کہنا چاہے اسے پورے سکون وصبر سے سننا چاہیے، یہ ضروری ہے کہ والدین بچے کو احساس دلائیں کہ وہ اسی کی طرف ہیں، دوسری اہم بات یہ ہے کہ بچے کو یہ سمجھانا چاہیے کہ وہ جو کچھ بیان کررہا ہے اس کو عقل سلیم کے ذریعہ کس طرح سوچ سکتا ہے اور اس طرح کے معاملات ومواقف کے ساتھ تعامل میں اس کا بہتر سے بہتر کیا اسلوب ہوسکتا ہے۔

جب بچے کے ساتھ اس نوعیت کا برتاؤ کیا جائے گا تو اس کے فوائد مخفی نہیں رہیں گے، اس کو فوری طور پر یہ اطمینان حاصل ہوگا کہ

والدین ہمیشہ اس کی بات سننے کو تیار رہتے ہیں، جلد غصہ نہیں ہوتے، اس پر کوئی حکم نہیں لگاتے اور اسے ڈانٹتے نہیں، اس طرح وہ والدین کے سامنے کھلی کتاب کی طرح رہے گا اور کھل کر بات کرے گا، دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ اس طرح والدین اس کو مسائل زندگی سے نمٹنے اور حکمتوں کو برتنے کا ہنر سکھائیں گے۔

فرض کیجئے بچہ کسی دن اسکول سے آتا ہے اور اس طرح کی ناشائستہ باتیں کرتا ہے اور زبان سے نامناسب الفاظ نکالتا ہے، تو آپ بہت نرمی اور سہولت سے اس سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کیجئے کہ اس نے یہ الفاظ کہاں سنا، پھر پوچھیے کہ وہ اس لفظ کا کیا مطلب سمجھ رہا ہے، پھر یہ دیکھیے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے کیا اس میں یہ لفظ اس کے لیے کوئی نیا اضافہ کر رہا ہے، یا پھر اس کی جگہ اس سے بہتر کوئی تعبیر اور اس مقام کے مناسب حال کوئی اور لفظ موجود ہے، آپ اس کو یہ سمجھانے کی کوشش کیجئے کہ مافی الضمیر ادا کرنے میں ہلکے پھلکے یا سوقیانہ الفاظ کا استعمال شروع شروع میں ہوتا ہے، البتہ زبان ان کلمات سے بے نیاز ہے، زبان میں ہمارے افکار و احساسات کی ادائیگی کے لئے مناسب و بلیغ الفاظ کا ذخیرہ موجود ہے، آپ اس کے ساتھ حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیجئے، پورے سکون و اطمینان اور مزاح کے اسلوب میں گفتگو کیجئے، اور کہیے کہ افسوس کی بات یہ ہے کہ بہت سے لوگ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں اور ایسے الفاظ کا استعمال غصہ اور جذباتی حالت میں کرتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ وہ کیفیات ہوتی ہیں جن میں مکمل ذہنی یکسوئی حاصل نہیں ہوتی۔

اسی طرح جب بچہ دینی اعتبار سے بھی غیر مناسب الفاظ استعمال کر بیٹھے تو غصہ اور چیخ پکار مچانے سے کچھ حاصل نہیں، سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا اسی کی روشنی میں دین وعقیدے سے متعلق مطلوب تشریح کیجئے، الزام لگانے والے کی روش اختیار کرنے کے بجائے ایک شارح اور معلم کا کردار ادا کیجئے۔

اگر کسی دن بچہ اسکول سے آکر یہ بتائے کہ وہ غیر مناسب کام میں شریک ہوا، مثلاً دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر اس نے کسی بچے پر زیادتی کی اور اس کو مارا پیٹا، تو والدین کو چاہیے کہ پہلے تو اس سے واقعہ کی تفصیلات سنیں، کیوں کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ کسی کام میں شرکت کر کے لطف اندوز ہوتا ہے اور اسے اس کے غلط ہونے کا احساس بھی نہیں ہوتا، جب وہ اپنی بات پوری کر لے تو اس کو سمجھانا چاہیے کہ اگر چہ اس نے اس بچے کو تکلیف پہنچانے کا قصد نہیں کیا لیکن سوچو تو سہی جس کے ساتھ زیادتی کی گئی وہ بچہ کیا محسوس کرے گا، اگر سبھی لوگ اس طرح کی حرکت کرنے لگیں تو پھر کیا حال ہوگا؟ اس طرح آپ اس کو یہ احساس دلائیں گے کہ اس نے وہ کام کیا ہے جس سے کسی کو تکلیف پہنچانا اس کا مقصد نہیں تھا، البتہ آپ اسی کے ساتھ اس کو یہ سمجھانے میں بھی کامیاب رہیں گے کہ آپ اس طرح کی کسی بھی حرکت کو قبول نہیں کریں گے، اس طریقے سے آپ اس کو حکمت کے ساتھ دوبارہ اس طرح کا عمل کرنے سے پہلے سوچنے پر مجبور کر دیں گے۔

بچے کی اچھی اور پختہ اخلاقی تعلیم و تربیت کوئی آسان کام نہیں ہے، بہت سے والدین افضل طریقہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بس بچے سے یہ کہہ دیں کہ وہ ایسا کرے اور ایسا نہ کرے، اگر وہ التزام نہ کرے تو پھر اس کو ڈرائیں دھمکائیں، لیکن یہ بات صاف ہے کہ یہ طریقہ کچھ زیادہ مؤثر نہیں، اس لیے کہ بچہ اس صورت میں فوراً ہی سزا سے بچنے کے لئے اخفاء جرم کی پالیسی اپنانے کی کوشش میں لگ جاتا ہے، بلکہ اور آگے بڑھ کر وہ والدین کے اصولوں سے بغاوت اور ان کی نافرمانی پر اتر آتا ہے۔

اخلاقی نشو نما میں والدین کا یہ بھی کردار ہے کہ وہ بچے کو دوسروں پر توجہ دینا اور دوسروں کی رعایت کرنا سکھائیں، اس کو عدم انانیت کی تعلیم دیں، اس کو نفس پر قابو کرنا سکھائیں، اس کو سمجھائیں کہ ان سب امور کے ذریعہ ہی تمام لوگ امن وسلامتی اور سکون ومحبت کے ساتھ رہ

سکتے ہیں، یہیں سے وہ اس طریقے کی حکمتوں کو سمجھنا شروع کر دے گا، اور اس کے اچھے ثمرات کو بھی محسوس کرے گا، قرآن مجید اخلاقی تربیت کے احکامات واصولوں اور مواقف سے بھرا ہوا ہے، انبیاء علیہم السلام کی زندگیاں بچوں کے لئے بہترین نمونہ کے طور پر اس میں موجود ہیں، اس کے علاوہ اللہ کو راضی کرنے والے اعمال اور اس کے بدلہ میں ثواب اور جنت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

دنیا میں مختلف قسم کے حالات ہیں اور بڑے پیچیدہ چیلنجز بھی، آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا بچہ ان حالات کو سمجھنا سیکھے، اچھا سلوک کرنے کے لئے وہ جرأت مندانہ فیصلہ لینا سیکھے، آپ یہ بھی یاد رکھیے کہ ہمیشہ یعنی پوری زندگی آپ اس کے ساتھ نہیں رہیں گے، وہ بھی وقت آئے گا جب آپ اس کو ہدایات دینے کے لئے اس کے پاس نہیں ہوں گے، اس لیے آپ اس کو یہ سکھایئے کہ وہ خود سے کسی طرح سوچے اور سمجھے، کس طرح ایک فہیم شخص کی طرح اور دوسروں کے احساسات و خیالات کا ادراک رکھنے والے کی طرح زندگی گذارے اور انسانوں کے ساتھ تعامل کرے۔

اس سلسلہ میں بعض ایسی کتابوں کا مطالبہ مفید ہوگا جو دینی تربیت کے موضوع پر لکھی گئی ہیں، اس ضمن میں ایک اہم کتاب علامہ عبداللہ ناصح علوان کی "تربیۃ الأولاد فی الإسلام" ہے (عربی کے بالمقابلہ ہماری اردو کا دامن اس سلسلہ میں بہت خالی ہے، البتہ افضل حسین صاحب مرحوم کی کتاب ''فن تعلیم وتربیت و تربیت'' اور مولانا حنیف عبدالمجید کی کتاب ''مثالی باپ'' اور ان ہی کی دوسری کتاب ''مثالی ماں'' بہت مفید اور جامع ہیں) یہاں بس ہم ان نکات کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں جن سے عام طور پر چھوٹے اور قریب البلوغ بچوں کی دینی تربیت میں نقصان پہنچتا ہے۔

۱۔ نفاق: بسا اوقات بچے کو والدین سے وہ تعلیم ملتی ہے جس کی عملاً زندگی میں تطبیق نہیں ہوتی، بلکہ معاملہ برعکس ہوتا ہے، اس سے بہت زیادہ نقصان ہوتا ہے، خاص طور پر یہ دھیان رکھنا چاہیے کہ بچہ فطری طور پر تطبیق کے لیے مثال ونمونہ کی طرف مائل ہوتا ہے، اس لیے اس پر توجہ کرنا چاہیے اور بچے کو نقصان پہنچانے سے (جو مقصد بھی نہیں) گریز کرنا چاہیے۔

۲۔ دینی شعائر کی تطبیق میں زبردستی: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں لا اکراہ فی الدین (بقرہ:۲۵۶)، مجھے ان لوگوں پر سخت تعجب ہوتا ہے جو اپنے بچوں کی تربیت میں سالہا سال تک غفلت برتتے رہتے ہیں، حتی کہ جب وہ بڑا ہو جاتا ہے اور جوانی کے قریب ہوتا ہے تو بھی نماز نہیں پڑھتا، پھر وہ حدیث رسول (واضربوھم علیھا وھم أبناء عشر) سے استدلال کرتے ہوئے اسے مارتے ہیں، میرا خیال ہے کہ اس حدیث میں نماز کی حد درجہ اہمیت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، اور بچپن سے ہی بچے کی تربیت پر توجہ دینے اور تربیت کا کوئی بھی وسیلہ نہ چھوڑنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اسی ضمن میں نماز کی اہمیت اور بچوں کی تربیت کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے ''مارنے'' کا ذکر بھی تمام انسانوں پر شفقت کرنے والے سراپا رحمت رسول اللہ ﷺ نے کیا ہے، وہ تو مومنین کے لیے رؤف ورحیم تھے، ان کا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا کہ تمام وسائل کو چھوڑ کر بس پٹائی کی جائے۔

۳۔ عبادات کو محض روایت بنا دینے کے نہ کوئی معنی ہیں نہ اس میں کوئی روح، اس کا علاج یہ ہے کہ اہل خانہ خود اپنے اندر اخلاص پیدا کریں اور عبادات کی انجام دہی میں زندگی کا ثبوت دیں، اخلاص وزندگی ان کے اعمال سے اس طرح ظاہر ہو کہ بچہ بلا واسطہ خود ہی والدین کے اخلاق وافعال میں اس کا اثر محسوس کرے۔

۴۔ عبادات کے باب میں بچوں اور والدین کے درمیان عدم اعتماد دینی واخلاقی تربیت کے لئے مضرت رساں ہے، اس لیے درحقیقت والدین کو بچے کے ذہن میں یہ بٹھانا چاہیے کہ عبادت در اصل بغیر کسی انسان کی نگرانی کے بندے، اور اس کے خالق کے درمیان براہ راست تعلق کا نام ہے۔

☆☆☆

❑ تجزیہ

ہندوتوا کا ایجنڈا اور مسلم پرسنل لاء

سید احمد ومیض ندوی، دارالعلوم حیدرآباد
Email: awameez@gmail.com

مسلم پرسنل لاء دراصل خدائی قانون کا نام ہے، جسے شریعتِ اسلامی کہا جاتا ہے، شریعتِ اسلامی میں بنیادی حیثیت عقیدۂ توحید کو حاصل ہے، عقیدۂ توحید کا خلاصہ یہ ہے کہ عبادت کے لائق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات ہے، اور خدا تعالیٰ ہی خالق ہے، بقیہ ساری کائنات اس کی مخلوق ہے، شمس وقمر، بحر وبر اور ارض وسماء جیسی بڑی بڑی مخلوقات بھی عبادت کے لائق نہیں ہوسکتیں، یہ سب اللہ کے بنانے سے وجود میں آئیں، اور اپنی تاثیر دکھانے میں بھی اللہ کی محتاج ہیں، ان ساری مخلوقات کو اللہ تعالیٰ نے حضرت انسان کے لیے پیدا فرمایا ہے، ارشاد ربانی ہے: هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُم مَّا فِیْ الْأَرْضِ جَمِیْعاً. (البقرۃ:۲۹) وہی خدا ہے جس نے تمھارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا فرمائیں، نیز یہ سب حضرت انسان کی خدمت کے لیے پیدا کی گئی ہیں، ارشاد ہے: وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِیْ السَّمَاوَاتِ وَمَا فِیْ الْأَرْضِ جَمِیْعاً (الجاثیہ:۱۳) اور اس نے تمھارے لیے زمین وآسمان کی ساری چیزوں کو مسخر کردیا ہے۔

جب یہ ساری مخلوقات انسان کی خدمت کے لیے پیدا کی گئی ہیں تو پھر وہ کیوں کر انسان کی معبود بن سکتی ہیں، توحید کا یہ عقیدہ ایک مسلمان کو ہر قسم کی شرکیات سے محفوظ رکھتا ہے، ایک مسلمان کے لیے عقیدۂ توحید جان ودل سے زیادہ عزیز ہے، مسلمان سب کچھ برداشت کرسکتا ہے؛ لیکن عقیدۂ توحید پر حرف آئے ہرگز برداشت نہیں کرسکتا، مسلم پرسنل لاء کی پوری عمارت اسی عقیدۂ توحید پر کھڑی ہے، جس میں شرک اور شرکیات کی دور دور تک کوئی گنجائش نہیں ہے، ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے، یہاں کے دستور میں سارے مذاہب کے پیروکاروں کو اپنی مذہبی تعلیمات پر عمل کی کھلی چھوٹ حاصل ہے، دستور کی رو سے یہاں کی جمہوری حکومت ملک کے کسی باشندے سے اپنے مذہبی عقائد اور شریعت سے دست برداری کا مطالبہ نہیں کرسکتی، اور نہ ہی کوئی ایسا قدم اٹھاسکتی ہے جس سے کسی کی مذہبی آزادی متاثر ہوتی ہو؛ لیکن ہندوستان کی یہ بدقسمتی ہے کہ یہاں آزادی کے زمانہ سے ایک ایسا طبقہ سر اٹھاتا رہا ہے جس نے ہمیشہ ملک کے سیکولر امیج کو متاثر کرنے کی کوشش کی ہے، اور بالخصوص یہاں کی سب سے بڑی اقلیت مسلمانوں کو ان کے مذہبی تشخص سے محروم کرنے کا حامی رہا ہے، یہ ہندوتوا نظریات رکھنے والا وہ ٹولہ ہے جو مسلمانوں سے نفرت ہی کو ملک کی سب سے بڑی خدمت سمجھتا ہے، ہندوتوا طاقتوں کا روز اول سے یہ ایجنڈہ رہا ہے کہ یہاں کی مسلم اقلیت کو مذہبی اعتبار سے ہندو اکثریت میں ضم کردیا جائے، اور مسلمانوں کی مذہبی شناخت اور ان کے اسلامی عقائد وتشخص کا یکسر خاتمہ کردیا جائے، عقیدۂ توحید کو جو دین اسلام

میں بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے مسلمانوں کے دل و دماغ سے محو کر کے انھیں شرکیات اور مشرکانہ طور وطریقوں کا دلدادہ بنادیا جائے، ہندوتوا طاقتوں کی سرخیل فرقہ پرست تنظیم آر ایس ایس ہے، اِدھر چند سالوں سے ہندوتوا طاقتیں اپنے ایجنڈے کو عملی جامہ پہنانے میں کچھ زیادہ ہی سرگرم عمل ہوچکی ہیں، اس وقت جن موضوعات کو بڑی شدت کے ساتھ اچھالا جارہا ہے ان سب کا تعلق مسلم پرسنل لاء کی اساسیات سے ہے، بھارت ماتا کی جئے کا مسئلہ ہو یا وندے ماترم کی بات، یوگا کے لزوم کا معاملہ ہو یا اسکولی طلبہ پر سوریہ نمسکار لاگو کرنے کی بات، نصابِ تعلیم میں بھگوت گیتا کی شمولیت ہو کہ سرسوتی وندنا کا معاملہ، ان ساری چیزوں کی زد براہ راست عقیدۂ توحید پر پڑتی ہے، اور یہی ہندوتوا کا اصل ایجنڈہ ہے، ذیل کی سطروں میں اختصار کے ساتھ ہندوتوا ایجنڈے کے مذکورہ بالا نکات کا جائزہ لیا جاتا ہے:

بھارت ماتا کی جئے :

اسلام دین فطرت ہے جس میں فطرتِ انسانی کا بھرپور لحاظ رکھا گیا ہے، اسلام اس بات سے منع نہیں کرتا کہ آدمی اپنی جائے پیدائش اور وطن سے محبت کرے، اس لیے کہ وطن سے محبت فطرت انسانی کا حصہ ہے؛ لیکن اسلام میں وطن کی پرستش اور اسے پوجنے کی اجازت نہیں ہے، وطن محبوب ضرور ہے لیکن کسی مسلمان کے لیے وہ معبود نہیں بن سکتا، مسلمانوں کے عقیدۂ توحید کو کاری ضرب پہونچانے اور ہندوستانی مسلمانوں کی حب الوطنی کو شک کے دائرہ میں لانے کے لیے ہندوتوا طاقتوں نے بھارت مات کی جئے کا مسئلہ ڈھونڈ نکالا، اور کہنے لگیں کہ حقیقی محبِّ وطن وہی ہے جو بھارت ماتا کی جئے کا نعرہ لگائے، اور جو اس نعرہ سے انکار کرے اس کی حب الوطنی مشکوک ہے، حالانکہ حب الوطنی کے اظہار کے لیے ملک کا شہری کسی خاص نعرہ کا پابند نہیں ہے، ملکی دستور میں بھی ایسی کوئی صراحت نہیں ملتی، آزادی کے بعد کے ۷۰ سالہ عرصہ میں کبھی کسی مخصوص نعرہ کو حب الوطنی کا معیار نہیں سمجھا گیا، یہ محض سنگھ پریوار کی اختراع ہے، برادرانِ وطن کے یہاں بھارت کے لیے ماتا کی جو تعبیر استعمال کی جاتی ہے اس کی حیثیت ویسی ہی ہے جیسے گاؤ ماتا یا گنگا میا کی ہے، بھارت ماتا میں ماتا دراصل دیوی کے معنی میں بولا جاتا ہے، جس طرح گاؤ ماتا میں ماتا دیوی کے معنی میں ہے، اس بات سے ہر شخص واقف ہے کہ ہندو بھائیوں کے یہاں بھارت ماتا منجملہ خداؤں میں ایک خدا ہے، ملک کی قدیم تہذیب پر لکھی گئی کتابوں میں ہندو مؤلفین نے بھارت ماتا کے دیوی ہونے کی صراحت کی ہے، اتنا ہی نہیں ملک کے مختلف علاقوں میں بھارت ماتا کے نام سے مختلف منادر پائے جاتے ہیں، جن میں باقاعدہ پوجا کی جاتی ہے، ہندوستان کے نقشہ پر شیر پر سوار جو دیوی دکھائی جاتی ہے اسی کو بھارت ماتا کے نام سے پکارا جاتا ہے، ہندو کلچر میں بھارت ماتا کا تصور ایک دیوی کا ہے، جس کے ہاتھ میں ترنگا ہوتا ہے، اسکولی ڈراموں یا یوم جمہوریہ تقاریب میں بھارت ماتا کو ایک دیوی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، بھارت ماتا کے اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر سوچئے کہ کیا مسلمان کے لیے اس قسم کے کسی نعرہ کی گنجائش ہوسکتی ہے؟ بعض سادہ لوح مسلمانوں کو اس سلسلہ میں مغالطہ ہوتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ بھارت ماتا دراصل مادر وطن کے معنی میں ہے، اس میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے، ایسے لوگوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اردو میں مادرِ وطن دیوی یا معبود کے معنی میں نہیں بولا جاتا؛ بلکہ وطن یا اداروں سے محبت کے لیے بولا جاتا ہے، جہاں تک وطن سے اظہارِ محبت کا تعلق ہے تو اس کے لیے مادرِ وطن اور جئے ہند جیسے الفاظ ہر طرح موزوں ہیں، مسلمان حب الوطنی کی

سرٹیفکٹ حاصل کرنے کے لیے سنگھ پریوار کے محتاج نہیں ہیں، اسلام میں ماں کو کتنا اونچا مقام حاصل ہے اس سے ہر شخص واقف ہے، ماں کے قدموں کے نیچے جنت بتائی گئی ہے؛ لیکن اس کے باوجود اسلام میں اولاد کو اجازت نہیں کہ وہ ماں کو معبود بنائیں؛ حتی کہ انبیاء کرام جیسی برگزیدہ ہستیوں کی بھی پرستش کی اجازت نہیں ہے، دین اسلام دین توحید ہے، جس میں خدائے وحدہ لاشریک لہ کے علاوہ کوئی لائق پرستش نہیں ہے۔

یوگا:

ورزش وریاضت اور صحتِ جسمانی کے خوش نما غلاف میں مسلمانوں پر زبردستی یوگا کو لازم کرنا بھی ہندوتوا طاقتوں کا ایک اہم ایجنڈہ ہے، اس وقت پورے ملک میں حکومتی سطح پر یوگا کے حق میں مہم چلائی جارہی ہے، اسکولی بچوں اور عام مسلمانوں کو یوگا سے قریب کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، عام طور پر یوگا کو ایک کھیل اور بدنی ریاضت کی مشق کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، اور یہ باور کرایا جاتا ہے کہ یوگا کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ محض ریاضت کی ایک شکل ہے، جس سے سکون قلب اور صحتِ جسمانی کی دولت حاصل ہوتی ہے؛ جب کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے، ہندوتوا کے حامی یوگا کو زندہ طلسمات کی طرح ہر مرض کی دوا قرار دیتے ہیں، یوگا کا آغاز کب ہوا قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا؛ البتہ اتنی بات ہے کہ یہ علم سادھو سنتوں پر تپسیا کے دوران منکشف ہوا، کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وادیٔ سندھ میں کھدائی کے دوران کچھ مہرے حاصل ہوئے جن پر انسان کی عجیب وغریب شکلیں کھدی ہوئی تھیں، ممکن ہے کہ یہ یوگا کی ابتدائی شکلیں ہوں، جو تین ہزار سال قبل مسیح سے متعلق رکھتی ہیں، ویدوں میں بھی یوگا کا ذکر ملتا ہے، اُپنشدوں میں یوگا کا تفصیلی ذکر موجود ہے، رامائن، مہابھارت اور بھگوت گیتا کے مطابق برہما جو کائنات کی اصل ہے وہ خود کرشن کے روپ میں عالم میں آئے، اور اپنے زمانہ کے ماہر جنگجو ارجن کو یوگا کے گر سکھائے، یوگا کی مشہور قسم راجا یوگا ہے، جس کا بنیادی خاکہ پتنجلی کے یوگا سوترا میں بیان کیا گیا ہے، لفظ یوگا سنسکرت لفظ یوگ یا یوگی سے مشتق ہے، جس کے معنی جوڑ کے آتے ہیں، اس لفظ کا انتخاب اس تصور کے ساتھ کیا گیا ہے کہ یوگا اس کے حامیوں کے خیال میں مخلوق کو خالق (برہما) کی ذات میں مدغم کرنے کا ذریعہ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظریہ تناسخ یوگا کا بنیادی جز ہے، بھگوت گیتا میں یوگا کی چار قسمیں مذکور ہیں، جن کی تفصیل سے پتہ چلتا ہے کہ یوگا کی جڑیں ہندوؤں کے قدیم دیومالائی قصوں اور ان کی مقدس کتابوں میں پیوست ہیں، یہ خالص ہندوانہ مذہبی عمل ہے جس کی بنیاد کفر وشرک پر ہے، اس بات کی دلیل یہ ہے کہ بھگوت گیتا میں یوگا کی سند موجود ہے، نیز یوگا میں پڑھے جانے والے سنسکرت کے اشلوک بھی اس کے ثبوت کے لیے کافی ہیں، خالق کائنات کا انکار خودی، زندگی، عبادت، وجود اور کون ومکان کا انکار اور انسانی خداؤں کا اقرار سب یوگا میں شامل ہے، یوگا کے متعلق ارجن وسری کرشنا نے یہ تعلیم دی کہ روحانی ارتقاء اور خواہشات سے چھٹکارے وآزادی کے لیے یوگا ضروری ہے۔ (Light of Yoga) یوگا کی ورزش صرف تندرستی کے لیے نہیں کی جاتی؛ بلکہ اس کا مقصد روحانی اور ہندو تہذیب کو پروان چڑھانا ہے، یوگا کی تمام مبادیات اسلامی عقائد سے راست ٹکراتی ہیں، یہ دراصل کفر وشرک کا علمبردار عمل ہے، یوگا میں توحید، رسالت، کتاب اللہ اور یوم آخرت کا انکار ہے، نیز اس میں مخلوق کے خالق میں حلول کر جانے کا عقیدہ ہے، یہ نظریۂ تناسخ سے ہم آہنگ ہے، نیز یوگا کے نتیجہ میں آدمی کو ہندو مذہبی کتابوں اور انسانی خداؤں کے ارشادات کی اطاعت ضروری ہوجاتی ہے، یوگا میں ہندو عقائد کے

مطابق روحانی وجسمانی تربیت دی جاتی ہے، یوگا کی کسرت کا اصل مقصد پرماتما (خالق) کی ذات میں اپنے کو ضم کردینا ہے، یوگا کے متعلق ہندو مذہبی کتابوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ سراسر کفر وشکر تک پہونچانے والا عمل ہے، تانتریکا میں لکھا ہے: ''شیوا ہندوستان کے جنگلوں میں یوگی کی حیثیت سے رہا کرتا تھا، وہ یوگا کی مشق کرتے کرتے کائنات کا عظیم خدا بن گیا۔ (تانتریکا ص: ۵) شنکر آچاریہ اور یوگی یوگا کے دوران سنسکرت کے جن گیتوں کو لازم قرار دیتے ہیں، وہ بھی سراسر اسلامی عقائد وایمانیات کے منافی ہیں، جو خالق ومخلوق کی تفریق کو مٹاتے ہیں، یوگا اصل میں ویدک اور ہندو جسے سناتن دھرم کہتے ہیں اس کی تہذیب کا خاص حصہ ہے، ہندو روایات کے مطابق یہ ایک خاص جسمانی وروحانی ورزش ہے جو ہندوستان میں شروع ہوئی، اور اس کا عملی اظہار اسی خطے کے مذاہب ہندومت، بدھ مت اور جین مت میں نظر آتا ہے، بدھ مت کے بانی مہاتما بدھ کی اکثر مورتیاں اسی یوگ کی حالت میں نظر آتی ہیں، یوگا دراصل ہندوازم کا ایک فلسفہ ہے، جس میں آتما (روح) پرماتما (بھگوان) اور شریر (جسم) کو مراقبہ کے ذریعہ ایک ساتھ مربوط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، یوگا کا پہلا طریقہ بھگوان شنکر نے ایجاد کیا تھا، اور دوسرا پتنجلی نام کے یوگ گرو نے شروع کیا تھا، یوگا کے حوالہ سے ان ساری تفصیلات کی روشنی میں یہ بات بلاتردد کہی جاسکتی ہے کہ کسی مسلمان کے لیے یوگا جیسی کسی ریاضت کی قطعی گنجائش نہیں ہے، یوگا کے اس مشرکانہ عمل کو حکمراں جماعت نہ صرف ملک کے سارے باشندوں پر زبردستی تھوپنا چاہتی ہے؛ بلکہ اسے دنیا بھر میں عام کرنا چاہتی ہے؛ چنانچہ ملک کے موجودہ وزیر اعظم نے وزارت عظمی سنبھالنے کے بعد پہلی کامیابی کے طور پر اقوام متحدہ سے ۲۱ر جون کو عالمی یوم یوگا منائے جانے کی منظوری حاصل کرلی، پھر دہلی کے راجپتھ کے سامنے ۳۵ر ہزار افراد کو خصوصی طور پر جمع کرکے یوگا کا عالمی ریکارڈ قائم کیا گیا، اُس وقت یہ بھی اعلان ہوا تھا کہ تمام سرکاری ملازمین کے ساتھ سارے تعلیمی اداروں میں طلبہ اور اساتذہ کو بھی یوگا کی مشق کرنی ہوگی۔

سوریہ نمسکار:

یوگا کا ایک اہم ترین حصہ سوریہ نمسکار ہے، یوگی کے لیے ضروری ہے کہ یوگا مشق کی ابتدا اور اس کے اختتام پر مشرق کی جانب آنکھیں بند کرکے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر سوریہ نمسکار کرے، جو کہ سورج کی پرستش ہی کی ایک شکل ہے، ہندوؤں کے یہاں سورج کو سوریہ بھگوان کہا جاتا ہے، مشرق کی طرف رخ کرکے آلتی پالتی بیٹھ کر سورج کے لیے سلام وآداب کو بجالانا سوریہ نمسکار ہے، جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے، بی کے ایس اینگر نے ویدوں کے حوالہ سے اس کی تعریف میں لکھا ہے کہ پرانا ماسے جسم اور عقل کی تمام ناپاک چیزیں خارج ہوتی ہیں اور مقدس آگ کے شعلے انھیں توانائی اور رعنائی کے ساتھ پاک کردیتے ہیں، تب ایک شخص دَھرانا اور دِھیانا کے قابل ہوجاتا ہے، اس مقام تک پہونچنے کے لیے طویل مدت درکار ہوتی ہے۔ (Light of Yoga page: 46) بحوالہ یوگا شریعتِ اسلامی کی روشنی میں)۔

حیدرآباد کے ایک دانشور جناب ابوالعزم نے سوریہ نمسکار کا ہندو مذہب سے کس قدر گہرا تعلق ہے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے: ''ہندو مذہب کے عقائد میں سوریہ پوجا کو بڑی اہمیت حاصل ہے، زندگی کے بیشتر کام طلوع شمس کے رخ کو ملحوظ رکھتے ہوئے کئے جاتے ہیں، ہر روز سورج کی پوجا وپرستش کی جاتی ہے، تمام ہندوؤں کے دروازے مشرق کی طرف کھلتے ہیں، سورج، چاند، ستارے،

زمین، بحر، پہاڑوں اور دریاؤں کی بھی پوجا کی جاتی ہے۔(یوگا شریعت اسلامی کی روشنی میں ص:۵۹)

سورج یا خدا کی کسی بھی مخلوق کو خدا کا درجہ دینا صریح شرک ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بحر وبر، ارض وسماء اور شمس وقمر کو حضرت انسان کے خادم کے طور پر ذکر فرمایا ہے، ارشاد ربانی ہے: وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ (النحل:۱۲) اور اس نے تمھارے لیے رات ودن اور سورج وچاند کو کام میں لگا رکھا ہے اور اس کے حکم سے ستارے بھی کام میں لگے ہوئے ہیں، دوسری جگہ ارشاد ہے: وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُسَمًّى (الرعد:۲) اور اس نے سورج وچاند کو مسخر کیا، ہر ایک متعین مدت تک کے لیے کام میں لگا ہے، قرآن مجید میں صاف طور پر سورج وچاند کی پرستش سے روکا گیا ہے، ارشاد ربانی ہے: لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ (فصلت:۳۷) تم نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو؛ بلکہ اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے ان چیزوں کو پیدا کیا، جناب ابو العزم کے مطابق ہزاروں سال قبل ہندو مہا گروؤں میں مشہور ماہر نجوم وفلکیات گزرے ہیں، عقل قدیمہ نے نظام شمسی کی کارکردگی کو دیکھ کر دھوکہ کھایا اور اسے اپنا رب اکبر سمجھ بیٹھے اور یہ ہندو عقیدہ کی بنیاد کا بڑا حصہ بن گیا۔(یوگا شریعت اسلامی کی روشنی میں ص:۵۹)۔

ہندوتوا طاقتوں کی کوشش ہے کہ ملک بھر کے طلبہ کے لیے سوریہ نمسکار کو لازم کردیا جائے، ایک رپورٹ کے مطابق صرف مدھیہ پردیش میں جہاں بی جے پی حکومت ہے پچاس لاکھ اسکولی طلبہ نے سوریہ نمسکار کیا، اس قسم کی سورج پرستی کی شریعت اسلامی اور مسلم پرسنل لاء میں قطعی گنجائش نہیں ہے۔

وندے ماترم:

مسلمانوں کو اسلامی تشخص سے محروم کرنے ہندوتوا طاقتوں نے جو ایجنڈا تیار کیا ہے اس کا ایک بنیادی جز مسلمانوں کو وندے ماترم گانے پر مجبور کرنا ہے، یہ مسئلہ بھی مسلمانوں کی حب الوطنی کو بنیاد بنا کر اٹھایا گیا ہے؛ جب کہ اس ترانے کا حب الوطنی سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ ہندوتوا طاقتوں کی اختراع ہے، اس ترانے پر اس لیے مجبور کیا جارہا ہے کہ یہ ترانہ صریح مشرکانہ عقائد وخیالات پر مشتمل ہے، اس ترانے میں کس قدر غیر اسلامی اور مشرکانہ نظریات کی آمیزش ہے اس کا اندازہ اس کے ترجمے سے کیا جاسکتا ہے، ذیل میں جو ترجمہ دیا جارہا ہے وہ اورنگ زیب ملک کا ہے جو ان کے تحقیقی مقالہ ''برصغیر میں قومی ترانے-تاریخ واثرات'' میں شامل ہے۔

''وندے ماترم''

۱- میں تیرا بندہ ہوں اے میری ماں!
اچھے پانی، اچھے پھلوں، بھینی خنک، جنوبی ہواؤں
اور شاداب کھیتوں والی میری ماں!

۲- حسین چاندی سے روشن رات والی
شگفتہ پھلوں والی، گھنے درختوں والی
میٹھی ہنسی، میٹھی زبان والی
سکھ دینے والی، برکت دینے والی میری ماں!

۳- تیس کروڑ گلوں کی پرجوش آوازیں
ساٹھ کروڑ بازوؤں میں سنبھلنے والی تلواریں
کیا اتنی طاقت کے ہوتے ہوئے بھی اے ماں تو کمزور ہے
تو ہی ہمارے بازوؤں کی قوت ہے میں تیرے قدم چومتا ہوں
تو دشمن کے لشکر کی غارت گر ہے میری ماں!

۴- تو ہی میرا علم ہے، تو ہی میرا دھرم ہے

تو ہی میرا باطن ہے، تو ہی میرا مقصد ہے
تو ہی جسم کے اندر کی جان ہے
تو ہی بازوؤں کی طاقت ہے
دلوں کے اندر تیری ہی حقیقت ہے
تیری ہی محبوب مورتی ہے ایک ایک مندر میں
۵- تو ہی درگا دس مسلح ہاتھوں والی
تو ہی کملا ہے کنول کے پھولوں کی بہار
تو ہی پانی ہے علم سے بہرہ ورہ کرنے والی
میں تیرا غلام ہوں، غلام کا غلام ہوں
اچھے پانی اچھے پھلوں والی میری ماں!
میں تیرا بندہ ہوں اے میری ماں

ترجمہ کو غور سے پڑھئے پھر خود فیصلہ کیجئے کہ کیا کوئی مسلمان اس ترانے کو پڑھنے کے بعد اپنے دین وایمان پر باقی رہ سکتا ہے؟ ترانے میں واضح الفاظ میں وطن کو معبود کا درجہ دیا گیا ہے جب کہ اسلامی عقیدے کے مطابق لائق عبادت تو خدائے وحدہ لاشریک لہ ہی ہے، اس کے علاوہ کسی کی پرستش کی قطعی اجازت نہیں، عقیدۂ توحید اسلام کا سب سے اساسی عقیدہ ہے، سارے نبیوں نے اپنی قوموں سے یہی دعوت دی، اعبدوا اللہ ما لکم من إلہ غیرہ اے میری قوم! ایک اللہ کی عبادت کرو، اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں، وندے ماترم میں مادرِ وطن کو کبھی دُرگا ماں اور کبھی کالی کی شکل میں پیش کر کے اس کی پرستش کی دعوت دی گئی ہے، مثلا یوں کہا گیا ہے: ''تو ہی دُرگا دس مسلح ہاتھوں والی ہے'' اسی طرح اس کا ایک بند یوں ہے: ''تیری ہی محبوب مورتی ہے ایک ایک مندر میں''، ''میں تیرا بندہ ہوں اے میری ماں''، ''سکھ دینے والی برکت والی اے میری ماں'' ان مصرعوں پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس ترانے میں جگہ جگہ شرکیہ الفاظ ادا کئے گئے ہیں، وندے ماترم کے تعلق سے دارالعلوم دیوبند کے فتوے کا یہ حصہ بھی لائق ملاحظہ ہے: ''اس گیت میں مندروں کی تمام مورتیوں کو خاک وطن کا عین قرار دیا گیا ہے، اور یہ خالص مشرکانہ نظریہ ہے، نیز اس گیت میں خاک وطن کو دُرگا دیوی اور کملا دیوی فرض کیا گیا ہے جو قطعا شرک ہے، اور اس گیت میں خاک وطن ہی کو دھرم قرار دیا گیا ہے جب کہ ایک مسلمان کا دھرم صرف اسلام ہے اور اس گیت میں خاک وطن کے سامنے وندنا کی جاتی ہے، یعنی سر جھکا کر ہاتھ جوڑ کر سلام کیا جاتا ہے، یہ بھی اسلامی تعلیمات کے سراسر منافی ہے، بادشاہ روم کے دربار میں رکوع کی طرح سر جھکا کر داخلہ سے انکار کرتے ہوئے ایک صحابی نے فرمایا تھا کہ مجھے کافر کے سامنے رکوع کی طرح سر جھکانے میں رسول اللہ ﷺ سے شرم آتی ہے کہ میں آپ کو کیا منھ دکھاؤں گا إني أستحيي من محمد عليه السلام أن أدخل على كافر على هيئة الركوع (نصاب الاحتساب، باب:۴۹، ص:۹۸) اور یہ گیت بھارت کے نقشہ پر پھول چڑھا کر شروع کیا جاتا ہے، یہ عمل بھی غیر اللہ کی عبات کے مشابہ ہے اور قطعا حرام ہے، وطن سے محبت کرنا اور بات ہے اور اس کی پوجا کرنا بالکل دوسری بات ہے، اس لیے وندے ماترم گیت مسلمانوں کے لیے کسی طرح بھی قابل قبول نہیں، ہر مسلمان پر دینی فریضہ ہے کہ وہ اس گیت کو روکنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرے''۔ (وندے ماترم کی حقیقت اور اس کی شرعیت حیثیت، مرتبہ ابو محمد صدیقی، ناشر: مجلس صیانۃ المسلمین، سہارنپور)

پہلی مرتبہ وندے ماترم کو رابندر ناتھ ٹائیگور نے پڑھا تھا اس کے دس سال بعد بنارس کے اجلاس میں سرلہ دیوی چودھرانی نے اسے ترنم سے گایا، اس نظم کو قومی اہمیت تب حاصل ہوئی جب لالہ

لجپت رائے نے وندے ماترم نامی ایک جریدہ جاری کیا، کانگریس کے اجلاس میں ٹائیگور نے اس نظم کا دُھن بھی بنایا لیکن جب اس نظم کو قومی علامت بنا کر پیش کیا جانے لگا تو خود ٹائیگور نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے ۱۹۳۷ء میں سبھاش چندر بوس کو ایک خط میں لکھا کہ وندے ماترم کا بنیادی عقیدہ دیوی دُرگا کی پرستش ہے اور یہ اتنا واضح ہے کہ اس میں کسی قسم کی بحث کی گنجائش نہیں ہے، بنکم نے دُرگا کو متحدہ بنگال کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے، مگر کسی مسلم سے یہ توقع نہیں کی جانی چاہئے کہ وہ حب الوطنی کے نام پر دس ہاتھوں والی دُرگا کی عبادت کرے (بحوالہ رابندر ناتھ کے منتخبہ خطوط، مطبوعہ کیمبرج یونیورسٹی) رابندناتھ کی اس وضاحت کے بعد کانگریس کے مسلم اراکین نے اس ترانے کی شدید مخالفت کی، جس کی وجہ سے اکتوبر ۱۹۳۷ء کو کانگریس نے ہنگامی طور پر ورکنگ کمیٹی کا اجلاس طلب کیا، اور اس میں مسلمانوں کا اعتراض تسلیم کرتے ہوئے وندے ماترم کے ابتدائی دو بند کی مخالفت کی گئی اور انھیں ہٹانے سے اتفاق کیا گیا، جواہر لعل نہرو نے بھی اس کی مخالفت کی تھی، مگر تقسیم ہند کے بعد اس متنازعہ نظم کو نہ صرف قومی نظم تسلیم کیا گیا بلکہ اس میں دو بند کی شرط بھی ہٹالی گئی، یہاں یہ چیز غور طلب ہے کہ ملک میں جن جن چیزوں کو قومی شناخت کا درجہ دیا گیا ہے وہ سب ایک ہی ہیں، مثلا ہندوستان کا قومی پرچم ترنگا ایک ہے، اسی طرح قومی جانور شیر ایک ہے، قومی پرندہ مور ایک ہے، نیز قومی نشان اشوک کا لاٹ ایک ہے، جب قومی درجے کی شناخت رکھنے والی ہر چیز ایک ہے تو پھر قومی گیت ایک کیوں نہیں؟ مسلمانوں نے کبھی ترنگے پر اعتراض نہیں کیا، اسی طرح مسلمانوں نے یہ نہیں کہا کہ شیر تو دُرگا کی سواری ہے ہم اسے قومی جانور نہیں مانتے، ایسے میں صرف قومی گیت کے تعلق سے مسلمانوں کی مجبوری کو کیوں سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ اس سے براہ راست مسلمانوں کے عقیدہ پر زد پڑتی ہے، اسلام میں وطن سے محبت کو ممنوع نہیں قرار دیا گیا، نبی رحمت ﷺ جب مکہ سے مدینہ ہجرت فرمانے لگے تو مکہ کی طرف مڑ کر اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کیا اور یوں فرمایا: اے مکہ! اگر تیری قوم مجھے نکلنے پر مجبور نہ کرتی تو میں ہرگز نہ نکلتا، نبی رحمت ﷺ نے جب مدینہ کو اپنا وطن بنالیا تو مدینہ سے ٹوٹ کر محبت فرمائی، آپ نے مدینہ کے لیے برکت کی دعا فرمائی، مسلمان جہاں بھی ہوتے ہیں اپنے وطن سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں، لیکن وطن کی پرستش نہیں کر سکتے، مسلمان وطن پسند ہوتا ہے لیکن وطن پرست نہیں ہوسکتا، اس لیے وندے ماترم کے مسئلہ کو لیکر مسلمانوں کی حب الوطنی پر انگشت نمائی کرنا سراسر شرارت ہے، نیز مسلمانوں کو اس کا پابند بھی نہیں کیا جاسکتا، ایسا کسی بھی قسم کا اقدام مذہبی آزادی سلب کر لینے کے مترادف ہے، ملک کی آزادی کے تئیں مسلمانوں کی قربانیاں روزہ روشن کی طرح واضح ہیں، اگر وندے ماترم ہی وطن سے محبت کی علامت ہے تو سب سے پہلے رابندر ناتھ ٹائیگور کو مورد الزام ٹھہرانا چاہئے، جنھوں نے جن گن من جیسا قومی ترانہ تحریر کیا، پھر سکھ بھی تو وندے ماترم کو ماننے سے انکار کرتے ہیں تو انھیں غدار وطن کیوں نہیں قرار دیا جاتا۔

☆☆☆

❑ انکار حدیث

استاد احمد امین اور حدیث پر اعتراضات

تلخیص وترجمانی: محمد فرید حبیب ندوی

گذشتہ مضمون میں ہم نے استاد احمد امین مرحوم کی طرف سے حدیث پر اٹھائے گئے بعض شکوک وشبہات پیش کیے تھے، اس مضمون میں ان کے کچھ اور اعتراضات اور ان کے جوابات پیش ہیں۔

۱۔ کیا عبد اللہ بن مبارکؒ مغفل فی الحدیث تھے ؟؟ استاد احمد امین اپنی کتاب کے ص ۲۶۰ پر وضاعین کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''وضاعین میں بہت سے حضرات سادہ لوح اور اچھی نیت والے بھی تھے، جو حدیث بھی انہیں ملتی اسے صحیح سمجھ کر قبول کر لیتے، اور پھر سنی ہوئی حدیث کو آگے روایت کر دیتے، لوگ ان کے صدق وصلاح کو دیکھتے ہوئے ان کی مرویات قبول کر لیا کرتے، جیسا کہ عبد اللہ بن مبارکؒ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ثقہ اور راست گفتار تھے، لیکن ہر آنے جانے والے سے روایت لے لیا کرتے تھے''۔

احمد امین نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ ابن مبارک کے بارے میں یہ قول صحیح مسلم میں موجود ہے۔

حقیقت یا فریب دہی: پہلی بات تو یہ کہ موصوف اس جگہ وضاعین کا ذکر کر رہے ہیں، اور وضاع وہ لوگ ہوتے ہیں جو خود کوئی حدیث گھڑ کر آپ ﷺ کی طرف منسوب کر دیں۔ اور جہاں تک بات ہے اس شخص کی جو نیک نیت ہو اور جو حدیث بھی اسے ملے وہ اسے جمع کر لے، تو ایسا شخص وضاع نہیں ہوتا ہے، اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ غافل مزاج ہے، لہذا اس کی روایت کو چھان پھٹک کے بغیر قبول نہیں کرنا چاہئے۔

دوسری بات یہ کہ استاد احمد امین نے عبد اللہ بن مبارک کا ذکر وضاعین کے ضمن میں کر کے فریب دینے کی کوشش کی ہے، اس طرح کوئی شخص بھی دھوکہ کھا سکتا ہے کہ عبد اللہ بن مبارکؒ بھی وضاعین میں شامل تھے۔

احمد امین کے مذکورہ بیان سے عبد اللہ بن مبارک کے بارے میں تین باتیں معلوم ہوتی ہیں:

(الف) وہ نیک طینت شخص تھے، ہر سنی ہوئی روایت کو بغیر تنقید وچھان پھٹک کے آگے نقل دیا کرتے تھے۔

(ب) لوگ ان کی صدق بیانی کے دھوکہ میں رہ کر ان کی تمام احادیث کو صحیح سمجھ کر قبول کر لیتے تھے۔

(ج) احمد امین نے جو عبارت مسلم سے نقل کی ہے وہ عبد اللہ بن مبارک سے متعلق ہے۔

استاد احمد امین کی یہ تینوں باتیں غلط اور ناقابل التفات ہیں۔

(الف) ابن مبارک ناقد حدیث تھے :

یہ کہنا کہ ابن مبارک حدیث میں سہل انگار تھے، بہت بڑا فریب ہے، حقیقت یہ ہے کہ ان کا شمار اپنے زمانے کے مشہور نقادوں میں ہوتا تھا۔ امام مسلم نے اپنے مقدمہ میں بہت سی ایسی مثالیں ذکر کی ہیں، جن میں ابن مبارک نے راویوں پر تنقید کی ہے۔ ایک روایت کے بارے میں کسی نے ابن مبارک سے پوچھا جس کو حجاج بن دینار براہ راست رسول اللہ ﷺ سے روایت کر رہا تھا، تو آپ نے فرمایا! حجاج بن دینار اور نبی اکرم ﷺ کے درمیان اتنی

مسافت حائل ہے کہ اسے طے کرنے میں سواریاں تھک کر چور ہوجائیں گی۔یعنی درمیان سے کچھ راوی حذف ہیں۔

مسلم نے نقل کیا ہے کہ ابن مبارکؒ نے فرمایا: ''ہمارے اور رواۃ حدیث کے درمیان سند معیار ومقیاس ہے''۔

ذہبی نے ذکر کیا ہے کہ ہارون الرشید نے جب ایک زندیق کو قتل کرنے کے لیے پکڑا تو اس نے کہا کہ ان ایک ہزار احادیث کا کیا ہوگا جو میں نے وضع کی ہیں؟ ہارون الرشید نے کہا: ابو اسحاق فزاری اور ابن مبارک ابھی زندہ ہیں، وہ ایسی ایک ایک حدیث کو الگ کر دیں گے۔ ابراہیم بن اسحاق کہتے ہیں: ابن مبارک نے فرمایا: میں نے چار ہزار شیوخ سے سماعت کی مگر ان میں سے روایت صرف ایک ہزار سے کی۔

اس تمام تفصیل سے واضح ہوا کہ عبداللہ بن مبارک ایک ماہر نقاد حدیث تھے، وہ ہر ایک سے روایت نہیں لیتے تھے، بلکہ پوری تحقیق اور چھان بین کے بعد ہی کی روایت قبول کرتے تھے۔

(ب) عوام الناس کی فریب خوردگی :

دوسری بات یہ تھی کہ لوگ ابن مبارکؒ کی صدق بیانی سے دھوکہ کھا کر ان کی روایات کو قبول کر لیتے تھے۔

یہ بات بھی غلط ہے، اس لیے کہ ابن مبارکؒ کوئی عام آدمی نہ تھے، بلکہ وہ اپنے زمانے کے مشہور نقاد اور امیر المؤمنین فی الحدیث تھے، ان کی ثقاہت وبزرگی پر تمام علماء کا اتفاق ہے، اس لیے عوام کے ان سے دھوکہ کھانے کی بات غلط ہے۔

ابن مہدی فرماتے ہیں: امام تو چار ہیں: ثوری، مالک، حماد بن زید اور عبداللہ بن مبارک۔

امام احمد فرماتے ہیں: ابن مبارک کے زمانے میں طلب حدیث میں ان سے آگے کوئی نہ تھا۔

ابن سعد فرماتے ہیں: ابن مبارک ثقہ، قابل حجت اور مکثر الحدیث تھے۔

حاکم کے الفاظ ہیں: ابن مبارک اپنے زمانے کے امام تھے۔

اس طرح کی اور بھی بہت سی شہادتیں ہیں، نسائی نے انھیں اپنے زمانے کا سب سے جلیل القدر عالم قرار دیا ہے۔

اب یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک ایسا شخص جس کی جلالت شان اور علمی عظمت پر سارے علماء متفق ہیں، آخری دور میں ایک شخص اٹھ کر اس پر یہ الزام لگائے کہ لوگ اس کی صدق بیانی سے دھوکہ کھا جاتے تھے۔

مذکورہ علماء کے مندرجہ بالا اقوال سے یہ الزام بھی غلط ثابت ہوا کہ وہ ہر سنی سنائی حدیث کو روایت کر دیا کرتے تھے، اس لیے کہ تمام علماء نے انہیں امام تسلیم کیا ہے اور امام کے بارے میں امام مالک نے فرمایا ہے: جو شخص ہر سنی سنائی روایت بیان کرے وہ امام نہیں ہوسکتا۔

(ج) امام مسلم کی رائے : استاد احمد امین نے ابن مبارک کے بارے میں امام مسلم کی جو رائے نقل کی ہے، تعجب ہوتا ہے کہ ان سے یہ دھوکے میں ہوا ہے یا یہ ان کی جسارت ہے۔

اصل روایت یہ ہے:"عن سفيان ، عن ابن المبارك : قال: بقية صدوق اللسان ولكنه يأخذ عمن أقبل وأدبر ". سفیان ثوری حضرت ابن مبارک سے نقل کرتے ہیں کہ بقیہ (ایک راوی) یوں تو راست گفتار ہے مگر ہر آنے جانے والے شخص سے روایت لے لیا کرتا ہے۔

اس جگہ احمد امین صاحب نے دو جگہ ٹھوکر کھائی ہے:

۱۔ انہوں نے اس قول کو ابن مبارک کے بارے میں سمجھ لیا، حالانکہ یہ بقیہ بن ولید کے بارے میں خود ابن مبارک کا قول ہے۔

اس کی تائید دوسری روایات سے بھی ہوتی ہے۔ ذہبی نے بھی ابن مبارک سے یہ قول بقیہ کے بارے میں نقل کیا ہے، ابن مبارک فرماتے ہیں: بقیہ ضعیف رایوں سے تدلیس کرتا ہے اور ہر کس وناکس سے روایت کرتا ہے۔

۲۔ وہ لفظ ''بقیہ'' کو ''ثقہ'' سمجھ بیٹھے، اس لیے یہ غلطی ہوئی۔

اب یہاں تین باتوں کا ہی امکان ہوسکتا ہے:

۱۔ انہوں نے یہ عبارت مسلم میں از خود پڑھی ہو گی، مگر اسے سمجھ نہ سکے۔

۲۔ سمجھ کر جان بوجھ کر تحریف کی۔

۳۔ انہوں نے یہ عبارت بذات خود مسلم میں نہیں دیکھی، بلکہ کسی مستشرق کی کتاب سے نقل کر دی۔ جس نے مسلم سے غلط طور پر نقل کیا ہوگا۔

ان تین احتمالات میں میرے نزدیک تیسرا احتمال زیادہ قوی ہے۔ اس لیے کہ یہ تو بعید ہے کہ وہ اسے سمجھ نہ سکے ہوں، دوسرا احتمال بھی قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا، اس لیے کہ وہ ایسی کتاب کی عبارت میں تحریف کی کوشش نہیں کر سکتے جو ہر مسلمان عالم کے گھر میں موجود ہوتی ہے۔ اور اسی وجہ سے میں نے صحیح مسلم کے دیگر بہت سے نسخے بھی دیکھے کہ ہوسکتا ہے کہ کسی نسخے میں یہ لفظ ہو جو احمد امین نے سمجھا ہے، اگر چہ سیاق سے اس کا غلط ہونا از خود واضح ہے مگر مجھے کسی بھی نسخے میں یہ لفظ نہیں ملا۔ اس لیے میری رائے یہی ہے کہ یہ کسی دشمن اسلام کا کارنامہ ہے، جس نے حدیث کے اس عظیم ستون کو دغدار کرنے کی کوشش کی ہے جیسا کہ گولڈ یزہر نے امام زہری کے ساتھ یہی حرکت کی۔ لیکن مستشرق تو عربی ذوق نہ ہونے اور اسلام دشمنی کی وجہ سے ایسا کر سکتا ہے مگر احمد امین جیسے عربی الذوق شخص سے ایسا کیوں کر ہوا؟ جب کہ سیاق خود واضح ہے۔

۲۔ **حدیث سد الأبواب**: استاد احمد امین نے صفحہ ۲۶۱ پر وضع حدیث کے اسباب ومحرکات ذکر کرتے ہوئے بعض صحابہ کے سیاسی اختلافات اور بنو امیہ و بنو عباس کی باہمی چپقلش پر روشنی ڈالی ہے، یہاں تک تو بات ٹھیک ہے، مگر آگے انہوں نے ابن ابی الحدید کے حوالے سے لکھا ہے کہ فضائل پر مشتمل احادیث وضع کرنے کی طرح شیعہ نے ڈالی ہے، ان کی دیکھا دیکھی حضرت ابو بکر کے طرفداروں نے بھی حضرت ابو بکر کی تعریف وتوصیف میں حدیثیں وضع کر ڈالیں۔ چنانچہ مداحین ابو بکر نے "لو کنت متخذا خلیلا" والی روایت کو اس روایت کے مقابلے میں گھڑا جس میں ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی کو اپنا بھائی قرار دیا ہے، اسی طرح دروازوں کو بند کرنے والی حدیث حضرت علی کے حق میں تھی، مگر حضرت ابو بکر کے چاہنے والوں نے اسے حضرت ابو بکر کے حق میں تبدیل کر دیا۔

ان دونوں روایتوں کو موضوع قرار دینے میں ابن ابی الحدید کو تو معذور مانا جا سکتا ہے کہ وہ شیعہ ہے، لیکن استاد احمد امین نے اس پر اس کا تعاقب کیوں نہیں کیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ انہیں موضوع سمجھنے میں ابن ابی الحدید کے ہم نوا ہیں۔

حالانکہ پہلی روایت کو بخاری نے ابن عباس اور ابن زبیر سے اور دوسری روایت کو بھی بخاری نے ابو سعید وابن عباس سے اور مسلم نے ابو سعید، جندب اور ابی بن کعب سے نقل کیا ہے۔

شیخین کے علاوہ ان دونوں روایات کو مالک، ترمذی، طبرانی، احمد، ابن عساکر اور ابن حبان وغیرہ نے بھی روایت کیا ہے۔

اس کے برعکس وہ روایت جس میں بزعم شیعہ حضور ﷺ نے اپنے اور حضرت علی کے درمیان مؤاخات کرائی کسی معتبر کتاب میں نہیں آئی۔

ابن تیمیہ فرماتے ہیں: محدثین کے نزدیک یہ موضوع ہے اس کو ایک جاہل کذاب نے وضع کیا ہے۔

اسی طرح حضرت علی کے دروازے کے سوا سب دروازوں کو بند کرنے والی روایت کو اکثر محققین نے موضوع قرار دیا ہے، جن میں ابن تیمیہ، ابن جوزی اور عراقی شامل ہیں۔

اور اگر یہ روایت صحیح مان لی جائے تو محدثین نے اس میں اور حضرت ابو بکر والی روایت میں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔

ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے مسجد کی طرف کھلنے والے سب دروازے بند کرنے کا حکم دیا، البتہ حضرت ابو بکر کی کھڑکی کو اس حکم سے مستثنی قرار دیا۔

گویا تطبیق یہ ہے کہ حضرت علی والی حدیث میں ''باب'' سے مراد دروازہ ہے، اور حضرت ابوبکر والی روایت میں اس سے مراد کھڑکی ہے، اور اس کی تائید ایک دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے، جس میں (کھڑکی) کا لفظ آیا ہے۔

یہ تطبیق نہایت مناسب ہے، چنانچہ طحاوی نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

۳۔ احادیث فضائل: احمد امین فجر الاسلام کے ص ۲۶۱ پر رقم طراز ہیں: ''آپ بہت سی احادیث دیکھیں گے جو امویوں، عباسیوں یا علویوں کی عظمت وفضیلت یا ان کی مذمت میں وضع کی گئی ہیں، اسی طرح قبائل کی فضیلت میں بہت سی احادیث وضع کی گئی ہیں۔ چنانچہ کتنی ہی احادیث قریش، انصار جہینہ اور مزنیہ کی فضیلت میں گھڑی گئیں، اسی طرح بہت سے شہروں کی فضیلت میں وضع کی گئیں، بلکہ ایک ایک شہر کی فضیلت میں کئی کئی احادیث گھڑی گئیں، چنانچہ مکہ، مدینہ، جبل، احد، حجاز، یمن، شام، بیت المقدس، مصر اور ایران وغیرہ کی فضیلت میں بکثرت احادیث وضع کی گئیں''۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فضائل پر مشتمل احادیث کا ایک بڑا حصہ موضوعات پر مشتمل ہے، لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ سب کی سب احادیث فضائل موضوع اور جھوٹی ہیں۔

ظاہر سی بات ہے کہ صحابہ کرام سبقت الی الاسلام اور دوسری بہت سی خصوصیات میں الگ الگ امتیاز کے حامل تھے، اس لیے اگر رسول اللہ ﷺ نے کسی موقع پر کسی صحابی کی تعریف فرمائی ہو تو اس میں تعجب کیسا؟

اسی طرح مکہ ومدینہ اور بیت المقدس کے بارے میں مدحیہ کلمات ارشاد فرمانا بھی قطعاً حیرت انگیز نہیں، اس لیے کہ مکہ مبدأ وحی ہے اور مدینے میں اسلامی ریاست کی داغ بیل پڑی اور اسی طرح بیت المقدس کی تعریف خود قرآن میں بیان کی گئی ہے۔

ہاں اس سے انکار نہیں کہ بعض افراد وقبائل اور شہروں کی تعریف یا مذمت میں احادیث گھڑی گئی ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ بالکل نہیں ہونا چاہئے کہ یا تو سب ہی احادیث کو صحیح قرار دے دیا جائے، یا بعض احادیث کے جھوٹا ہونے کی وجہ سے سب کی یک قلم تکذیب کر دی جائے، معتدل رویہ یہی ہے کہ محدثین نے روایات کی تنقید کے جو اصول وضع کیے ہیں ان پر انھیں پرکھ کر دیکھا جائے، جس روایت کی سند اور متن مطلوبہ معیار پر ہو اسے قبول کیا جائے، اور جو اس معیار پر پوری نہ اترے اسے رد کر دیا جائے۔

چنانچہ خود بخاری میں مہاجر وانصار بعض خاص صحابہ جیسے ابوبکر وعمر، عثمان وعلی، سعد، ابی اور معاذ وغیرہم نیز مکہ ومدینہ، یمن وشام اور اسی طرح بہت سے قبائل جیسے قریش، مزنیہ اور جہینہ وغیرہ کی فضیلتوں کا ذکر ہے۔

یہی مناسب طرز عمل ہے اور یہی محدثین وعلماء کا طریقہ رہا ہے، لیکن نہیں معلوم احمد امین اس حقیقت سے کیسے ناواقف رہے؟ چند احادیث کی وجہ سے تمام احادیث کو مشکوک قرار دینا یہ مستشرقین کا وطیرہ رہا ہے اور احمد امین نے بھی انہی کی پیروی کی ہے۔

٤۔ احادیث ابی حنیفہ: احمد امین لکھتے ہیں: ''وضع حدیث کا دوسرا سبب فقہی وکلامی اختلافات ہیں، چنانچہ کوئی فقہی مسئلہ ایسا نہیں ہے، جس کی تائید میں کوئی حدیث موجود نہ ہو، حال یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ جن کے بارے میں منقول ہے کہ ان کے پاس صرف چند احادیث تھیں اور بقول ابن خلدون صرف سترہ حدیثیں تھیں، ان کے مسلک کی کتابیں احادیث سے لبریز ہیں، بلکہ کہیں کہیں تو حدیث کے الفاظ فقہی متون سے ملتے جلتے ہیں''۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فقہی اور کلامی اختلافات بھی وضع حدیث پر اثر انداز ہوئے تھے، لیکن یہ کہنا کہ امام ابوحنیفہ کو صرف سترہ احادیث یاد تھیں، یہ کھلی غلطی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ مسلک حنفی تفریع واستنباط کے اعتبار سے تمام فقہی مسالک سے کشادہ تر ہے، اب اگر امام صاحب کو صرف چند احادیث یاد ہوتیں تو وہ اتنی تھوڑی حدیثوں سے لاکھوں مسائل کیسے مستنبط کر سکتے تھے۔

دوسری بات یہ کہ خود مسند ابوحنیفہ اور دیگر ایسی مسانید جن میں

آپ کے شاگردوں نے آپ کی مرویات جمع کردی ہیں، اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ آپ کو اکثر احادیث کا علم تھا اور یہ کہ فقہ حنفی کے بہت سے مسائل حدیث سے ماخوذ ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ پھر ابن خلدون نے یہ بات کیسے کہی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ انھوں نے یہ بات صیغۂ تمریض (قیل) سے نقل کی ہے، جس سے خود اس کے کمزور ہونے کی طرف اشارہ ہوتا ہے، بلکہ خود علماء کے بیانات شاہد ہیں کہ امام موصوف کو اکثر احادیث کا علم تھا، آپ کے بارے میں مزید تفصیل آگے آئے گی۔

۵۔ حدیث پر اعتماد کرنے میں غلو ومبالغہ : احمد امین صاحب نے اسباب وضع کی نشان دہی کرتے ہوئے یہ بات بھی لکھی ہے کہ حدیث پر لوگ حد سے زیادہ اعتماد کرتے تھے، اس لیے لوگوں نے اس اعتماد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت سی حدیثیں وضع کر ڈالیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں طویل کلام کیا ہے، جس سے مندرجہ ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں:

۱۔ حلال وحرام کے احکام جب محض اجتہاد پر مبنی ہوئے تو ان کی وہ حیثیت نہ ہوئی جو ان احکام کی ہوئی جو حدیث پر مبنی تھے۔

۲۔ حدیث پر اعتماد میں مبالغہ کی ہی وجہ تھی کہ اس زمانے میں بہت سے علماء حکمت وموعظت کی ان باتوں کو رد کر دیتے تھے جو ہندی، زردتشت ایرانی اور شروح توراۃ وانجیل سے ماخوذ ہوں۔

۳۔ اسی لیے لوگوں نے من گھڑت فقہی احکام، ہندی وزردتشتی فلسفے اور اسرائیلی ونصرانی حکمت کو حدیث کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی۔

حقیقت حال:

۱۔ پہلی بات سے احمد امین گویا یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ کچھ احکام ایسے بھی ہوتے ہیں، جو حدیث پر مبنی نہیں ہوتے، حالانکہ یہ سراسر بہتان ہے، تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ کوئی بھی مجتہد کتاب وسنت کی طرف رجوع کیے بغیر اجتہاد نہیں کرسکتا، بلکہ لامحالہ اسے ان دونوں مصدروں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، پھر بعض لوگ قیاس سے بھی استدلال کرتے ہیں، اور بعض نہیں کرتے، لیکن جو قیاس کو دلیل مانتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ قیاس کی بنیاد بھی کسی نہ کسی نص قرآن یا حدیث پر ہی ہوتی ہے، اس لیے ایسا کوئی حکم ہے ہی نہیں جس کی بنیاد قرآن یا حدیث پر نہ ہو۔ امام ابن عبدالبر ''جامع بیان العلم'' میں امام شافعی سے نقل کرتے ہیں: ''علمی دلیل کے بغیر کسی شخص کو حق نہیں کہ وہ کسی چیز کو حلال یا حرام کہے، اور علمی دلیل وہ ہے جو کتاب وسنت یا اجماع وقیاس میں ہو''۔

۲۔ اور جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے تو وہ بھی سراسر بہتان ہے، ہم کسی امام کو نہیں جانتے جس نے کسی حکیمانہ بات کو صرف اس لیے رد کر دیا ہو کہ وہ قرآن وحدیث میں مذکور نہیں، بشرطیکہ وہ بات اسلامی اصولوں سے ٹکراتی نہ ہو، اس کے برعکس ان کا طرز عمل تو یہ تھا کہ ''حکمت مؤمن کا گمشدہ سرمایہ ہے، وہ جہاں بھی ملے اسے لے لے''۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن وحدیث میں سابقہ قوموں کے واقعات اور ان کے حکم ومواعظ نقل کیے گئے ہیں اور خود رسول اللہ ﷺ نے گزشتہ اقوام کی ایسی باتوں کو قبول کرنے کا حکم دیا، جو شریعت اسلامی سے ٹکراتی نہ ہوں، یہی وجہ ہے کہ علماء کرام نے اسرائیلی روایات کو قبول کرنے میں کوئی تخلف نہ کیا، بلکہ کعب احبار اور وہب بن منبہ جیسے حضرات سے بکثرت روایات نقل کیں، اگر سچائی وہی ہے جو احمد امین نے بیان کی ہے تو علماء ان روایات کو کیسے قبول کر لیتے؟

۳۔ اپر ذکر کی گئی تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ احمد امین صاحب نے وضع حدیث کا جو سبب بیان کیا ہے، وہ قطعی طور پر بے بنیاد ہے۔ ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ دیگر بہت سے اسباب کی وجہ سے احادیث گھڑی گئیں، مگر یہ سبب قطعاً نہیں کہ علماء حکیمانہ باتوں کو قبول نہ کرتے تھے، اس لیے لوگوں نے انھیں حدیث بنا ڈالا، تاکہ انھیں قبول عام حاصل ہوسکے۔ (السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی، ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی مرحوم)

☆☆☆

❑ فکر اسلامی

(قسط-۲۴)

مفکر اسلام- ایک مطالعہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

نصاب تعلیم : عرصہ سے یہ بحث جاری ہے کہ ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو، حضرت مفکر اسلامؒ کی تحریروں میں جا بجا اس حقیقت پر گفتگو ہے کہ نصاب تعلیم میں حذف واضافہ اور ترمیم ممکن ہے، دینی قیادت کی تیاری کے لئے بھی اور دعوت وتبلیغ کو مؤثر بنانے کے لئے بھی، ہر لمحہ یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ وقت کے تقاضوں کو کیسے پورا کیا جائے، ملک میں جو زبان سمجھی جائے اس کو کیسے سیکھا جائے، ایسے افراد اور ایسی صلاحیتیں کس طرح پیدا ہوں جو اسلام کی خدمت کرسکیں، اسلام کو مختلف صلاحیتوں کی ضرورت ہے، لیکن ۔۔۔۔تصور تعلیم نے صلاحیتوں کو اس طرح تقسیم کردیا ہے کہ ایک دنیا پر قانع طبقہ ہے تو دوسرا دنیا سے ناواقف، زمانے کے تقاضوں سے دور اپنے گوشۂ عافیت میں محفوظ، چند امور کی انجام دہی کے بعد یہ سوچ کر مطمئن کہ یہی اسلام کی خدمت ہے اور بلکہ اقبالؒ کے الفاظ میں ''سجدہ کی اجازت'' کو ''اسلام کی آزادی تصور'' کرتے ہیں، اور مدارس و نصاب مدارس یا بعض دعوتی کوششوں کو ہی اسلام کی خدمت سمجھتے ہیں، مولاناؒ لکھتے ہیں:۔

''خود آپ کا نصاب تعلیم اس حقیقت کا گواہ ہے کہ علماء اسلام نے کسی ضرورت کے تسلیم کرنے اور کسی مفید و ناگزیر چیز کو قبول کرنے میں کبھی پس وپیش نہیں کیا، یہ نصاب عہد بہ عہد تبدیلیوں اور مختلف علمی وعقلی رجحانات کا نمائندہ ہے، اس میں ہر دور میں اضافہ و ترمیم ہوتی رہی ہے، صرف یہ سو برس کا زمانہ ایسا ہے، جس میں اس نصاب میں کم سے کم تبدیلی ہوئی ہے، حالانکہ یہی زمانہ اپنی سیاسی ومذہبی تبدیلیوں کی بناء پر جائز اور ضروری تبدیلیوں کا سب سے زیادہ مستحق ومتقاضی تھا۔

عزیزو! اس عہد انقلاب میں دین کی نمائندگی، تعلیمات اسلام کی ترجمانی اور نہ صرف ان کی تشریح وتفہیم بلکہ ان کی بلندی وبرتری کا نقش قائم کرنے کے لئے بڑی وسیع تیاریوں اور بڑی متنوع صلاحیتوں کی ضرورت ہے، آپ اسلام کے سپاہی ہیں، اور زندگی کے معرکہ کے لئے تیار ہورہے ہیں، کسی فوجی تربیت گاہ اور وہاں کی تیار ہونے والی فوج کے لئے سب سے زیادہ ناموزوں سب سے زیادہ خطرناک بحث، قدیم وجدید اسلحہ اور طریق جنگ کی بحث ہے، سپاہی کے لئے نہ کوئی ہتھیار قدیم ہے نہ جدید، اس کو تو یہ دیکھنا ہے کہ میدان جنگ کے لئے کون سا ہتھیار کارگر ہے، اور کون سا طریق جنگ موزوں، تیار ہونے والے سپاہی کے لئے تعصب کی کوئی گنجائش نہیں، اس کا نہ کسی خاص اسلحہ سے رشتہ ہے نہ کسی خاص فن جنگ سے، اس کو تو تمام ضروری اسلحہ سے مسلح ہونا چاہئے، عرب شاعر نے بہت پہلے کہا تھا۔

کلّ امری یسعی الیٰ یوم الهیاج بما استعدّا"

اس سے آگے بڑھ کر مزید وضاحت کے ساتھ جو کچھ فرمایا وہ کھلی کتاب کی طرح ہے، ہر مدرسے میں صاف طور پر اس نقش کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، مولانا نے جس چیز کی دعوت دی، اس کی

افادیت سے کس کو انکار کی مجال! لیکن افسوس کہ آج مدارس کا ماحول فکر ومطالعہ اور تصنیف وتالیف کے ذوق سے یکسر خالی، وقت کے فتنے تو دور اس عہد کے طوفانون سے نابلد، بس ایک لکیر ہے جس کے پیٹنے کا عمل جاری ہے:

''آپ کو نئے فتنوں سے واقف ہونا چاہئے، مگر سطحی واقفیت عدم واقفیت سے زیادہ مضر ہے آج ہمارے مدارس میں فیشن کے طور پر بعض تحریکوں اور نظاموں کے نام لئے جاتے ہیں، لیکن ان کے متعلق بہت کم معلومات ہیں، ناقدانہ نظر اور محققانہ مطالعہ تو بڑی چیز ہے، ان کی اجمالی حقیقت سے بھی واقفیت نہیں، ضرورت ہے کہ ماہرین فن اور اہل نقد ونظر کی نگرانی اور رہنمائی میں ان کا مطالعہ کیا جائے اور اسلام کے نظام کی برتری ثابت کی جائے، یہ کام مشکل ہے، لیکن ضروری ہے، اگر یہ مدارس کے اہتمام میں منظم طریقہ پر نہ ہوا تو وہ غیر منظم طریقہ ہوگا۔'' (پاجا سراغ زندگی۔ص،۱۱۲۔۱۱۳)

موجودہ عہد کی سب سے بڑی پریشانی : میں نے کئی مرتبہ لکھا کہ ہمارا اصل مسئلہ ناخواندگی نہیں بلکہ تعلیم یافتہ طبقہ میں پائی جانے والی بے ضمیری ہے، خواندگی کی مقدار کم ہونے سے زیادہ خطرناک اور اہم مسئلہ یہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ کے بے فکر و بے ضمیر ہونے کے سبب ملت کا مقدر سنورنا مشکل ہوگیا ہے، گمراہ کن افکار اور ان کی تائید کرنے والوں کا ایک ازدحام ہے، پیشہ وری (Professionalism) نے ضمیر کی آواز کو دبا دیا ہے،، حضرت مفکر اسلامؒ نے بہت پہلے اور بہت صاف کہا تھا:

''یہ عام ضمیر فروشی اور دین فروشی کا دور ہے، بڑے بڑے فاضل اور صاحب قلم ہیں، جن کی ذہانت، اور جن کے مطالعہ کے سامنے ہماری کوئی حیثیت نہیں، لیکن ضمیر کے نام کی کوئی چیز ان کے یہاں پائی نہیں جاتی، ان کے دماغ کی جگہ پر دماغ ہے، اور دل کی جگہ پر بھی دماغ ہی ہے، بلکہ ان کے پہلو میں ایک دھڑکتے ہوئے دل کے بجائے ایک رواں دواں قلم رکھا ہوا ہے، جو سب کچھ لکھ سکتا ہے، جس کے یہاں آخرت کی جوابدہی، اور ضمیر کی ملامت اور سرزنش کا کوئی سوال نہیں، ان میں زمانہ کے ساتھ بدلنے، اور اس کے مطالبوں کی ترجمانی کرنے کی غیر محدود صلاحیت ہے۔'' (پاجا سراغ زندگی۔ص،۱۴۸)

نئی قیادت کی ضرورت : آج جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اسی کا سب سے زیادہ فقدان ہے، ایک اعتماد، ایک دینی قیادت جو ملک وملت کو درپیش خطرات سے نہ صرف آگاہ کرسکے بلکہ اس سے ان کو نجات دلا سکے اس کی ضرورت ہے، انھیں مدارس سے اس قیادت کا خمیر پہلے تیار ہوا ہے اور ان ہی سے پھر اس کی امید کی جاسکتی ہے اسی لئے مولاناؒ نے طلبۂ مدارس کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

''آپ یہاں سے مدرس بن کر نکلیں، مبارک، آپ علمی متون کے شارح ہوں، مبارک، آپ واعظ وخطیب ہوں، مبارک، آپ کتابوں کے مصنف ہوں، مبارک، میں بھی اس کا گنہگار رہوں، لیکن اس وقت زمانہ کو اس سے زیادہ کسی اور چیز کی ضرورت ہے، اس وقت زمانہ کو مردان کار کی ضرورت ہے، جو اس نئے دور کو ایک نئی فکری قیادت، ایک نیا دینی اعتماد، ایک نئی روحانی واخلاقی قوت عطا کرسکیں، اگر ایسا نہ ہوا تو ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بڑا خطرہ ہے، اور اس ملک کے لئے بھی، آج زمین ہمارے پاؤں تلے سے نکلتی جارہی ہے، اور بالکل وہی صورت حال ہے، جس کی قرآن مجید نے اپنے معجزانہ الفاظ میں تصویر کھینچی ہے۔

أو لم يروا أنا نأتي الأرض ننقصها من أطرافها (سورۃ الرعد۔۴۱) اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹائے چلے جاتے ہیں۔

وضاقت عليهم الأرض بما رحبت وضاقت عليهم أنفسهم (سورۃالتوبہ۱۱۸)اورزمین باوجود(اتنی بڑی)فراخی کے ان پرتنگ ہوگئی اوران کی جانیں ان پردوبھرہوگئیں۔

آج ہم جس زمین پرکھڑے ہوئے ہیں،اورجس پردینی وعلمی مرکزوں کے قلعےتعمیر کررہے ہیں،وہ کوئی پتھر کی چٹان یا مسطح میدان نہیں ہے،وہ ریت کاایک تودہ ہے،جس کے ذروں کو ہواؤں کے طوفان اڑارہے ہیں،اورجو برابر ہمارے نیچے سے کھسک رہی ہے،یہ وہی زمین ہے،جس کوقرآن مجید نے "كثيبا مهيلا" کہا ہے۔(پاجاسراغ زندگی۔ص،۱۴۸۔۱۴۹)

ایک تاریخی حقیقت : آج اکثرتحریکوں اور اداروں میں جمود پایا جاتا ہے،بےشمارٹھوس بنیادوں پراٹھنے والی تحریکیں اور قائم ہونے والے ادارے ایسا لگتا ہے کہ کام کرتے کرتے تھک چکے ہیں،اوراب صرف عظمت رفتہ اورایام گزشتہ کی تاریخ کےسنہرےابواب پرفخرکرناہی ان کامقدربن گیاہے،لیکن ظاہر ہے کہ اس رویہ سے تحریکوں و اداروں کا باقی رہنا مشکل ہے ،حضرت مولاناؒ نے اس رویہ پرسخت تنقید کرتے ہوئے صریح الفاظ میں قرآن کی روشنی میں فرمایا تھا:

''دنیا میں کوئی ادارہ محض اس وجہ سے نہیں چل سکتا کہ یہ ادارہ آج سے سو برس دوسو برس پہلے قائم ہوا،اوراس نے کچھ مفید خدمت انجام دی تھی محض تاریخ کے بل پر،محض تاریخ کے سہارے کوئی ادارہ،کوئی تحریک،کوئی فلسفہ،کوئی نظام نہ چلا ہے نہ چلے گا،اگر آپ کسی ادارے کو قائم رکھنے کے لئے اور اس کے لئے کچھ مراعات حاصل کرنے کے لئے اس کی تاریخ پیش کرتے ہیں کہ اس نے دور ماضی میں یہ خدمات انجام دیں،تو لوگ اس کو بالکل نہیں سنیں گے،اوراگرکوئی آج خاموش ہوجائے گا،تو کل اس کے اندر سے نہایت پرزوراور پرجوش تقاضہ پیدا ہوگا کہ اس کوختم کردینا چاہئے''۔ (پاجاسراغ زندگی۔ص،۱۵۹)

بقاء کے لئے افادیت کا ثبوت لازمی ہے :

آج برصغیر میں دن بدن مدارس کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے،لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ غیرہی نہیں اپنے بھی اورمخلصین بھی مدارس کے قیام اوران کے کام پرسوال کھڑے کررہے ہیں،کہیں نہ کہیں نقص ضرور ہے،اور سچ یہ ہے کہ مدارس کی جونافعیت وافادیت نظرآنی چاہئے وہ نہیں نظرآتی،جس کے سبب لوگوں کواس کا موقع مل رہا ہے کہ وہ مدارس کے قیام وکام پرسوالیہ نشان لگائیں۔

وہ مقتضیات زمانہ سے ناواقف،ضروریات زمانہ کو پورا کرنے سے قاصر اوراپنے مقاصد سے دور ہوتے جارہے ہیں،قانون قدرت میں بھی زندگی کا استحقاق صرف نفع پہونچانے والوں کو ہی ہے،مولاناؒ نے بڑی جرأت وصراحت کے ساتھ فرمایا:۔

''اگرہمارے مدارس یہ چاہتے ہیں کہ وہ باقی رہیں،اوروہ اس زندگی میں اپنی جگہ بنانا چاہتے ہیں،زندگی کا استحقاق ثابت کرنا چاہتے ہیں تو ان کواپنے اندر نافعیت پیدا کرنی چاہئے،یعنی ان کو اپنے جوہر کا ثبوت دینا چاہئے،ان کو یہ ثابت کرنا چاہئے کہ زندگی کی کوئی ضرورت ہے جوان کے بغیر پوری نہیں ہوتی''۔(پاجاسراغ زندگی۔ص،۱۶۱)

مکاتب کا قیام : کوئی دوسال قبل میں نے شوال کے اداریہ میں لکھا تھا کہ اس وقت ایک چیز بعض وجوہات کی بناپر بے معنی اورزائد سمجھ میں آتی ہے وہ ہر ہر چپہ پردارالاقامہ والے مدارس کا قیام ہے،ہرجگہ بڑے بڑے مدرسوں اوردارالعلوم کی ضرورت نہیں،لیکن ہرگلی محلّہ میں مکتب کی ضرورت ہے،میں نے بعض دیگر اسباب کی بناپر یہ بات لکھی جن کا وہاں تذکرہ ہے،لیکن حضرت مولاناؒ نے اس سے کہیں آگے کی بات فرمائی اورایک بڑاحقیقت پسندانہ سبب ذکرکیا:

''دوسری چیز دینی مکاتب کا قیام ہے، معاف کیجئے گا، میں اس وقت عربی مدارس کی افادیت کا اتنا قائل نہیں ہوں کہ قصبے قصبے میں ہوں اور ہر جگہ دورہ ہو، اور ہر جگہ بخاری شریف ضرور ختم ہو، لیکن ان مکاتب کی ضرورت زیادہ ہے، یعنی مسلمانوں کو دین کے مبادیات سے واقف کرانا، اردو کا تحفظ اور دینیات سے واقفیت اور حلال و حرام اور اس سے بڑھ کر کفر و ایمان اور توحید و شرک، ان کا امتیاز ان کو ہو جائے، ہم آپ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، اور تیزی کے ساتھ ہندوستان بدل رہا ہے، ہر چیز کو نیشنلائز کیا جا رہا ہے، یونیورسٹیوں کی باری آگئی، مسلم یونیورسٹی کی باری آگئی، کل مدارس کی باری آسکتی ہے، تو اس کے لئے مکاتب کا جال بچھا دیجئے، اور مساجد کو مسلمانوں کی زندگی کا مرکز بنایئے، سب سے آخر میں انقلاب کے قدم جہاں پر پہونچیں گے، وہ مسجدیں ہیں، اس لئے آپ ایسی جگہ مرکز بنایئے، جہاں دیر میں انقلاب پہونچے، یا وہاں تک پہونچتے پہونچتے قیامت آجائے''۔ (پاجا سراغ زندگی۔ص۔۱۷۳۔۱۷۴)

ایک مؤثر مجلس میں واضح پیغام: مولانا کا مزاج ایسا داعیانہ تھا جس میں قرآن کا نور اور اسلامی غیرت و خودداری رچی بسی ہوئی تھی، اسی لئے انکو کوئی موقع، کوئی مجلس صدائے حق بلند کرنے سے نہیں روک پاتی تھی، وہ صاحب فکر تھے اور صاحب فکر کو ہر وقت اپنی فکر کو دوسروں میں منتقل کرنے کا احساس رہتا ہے، اس کے اسالیب میں تنوع ہوسکتا ہے اور طریقوں میں اختلاف ممکن ہے لیکن ہر صاحب فکر بڑھ کر اپنی بات کہہ دینے کا موقع ڈھونڈتا ہے، ندوۃ العلماء کے ۸۵ سالہ جشن میں جب متعدد عرب ممالک کے وزراء، امراء نمائندے اور علماء وزعماء موجود تھے تو مولانا نے اس موقع پر خطبۂ استقبالیہ میں بڑی طاقتور صراحت کے ساتھ ایک طرف عرب ممالک کے اضطراب و کشمکش کا نقشہ کھینچ کر انہیں رجوع الی الاسلام کا پیغام دیا تو تو دوسری طرف اہالیان ہند کو ان کی وہ ذمہ داری یاد دلانے کے ساتھ جو ان کی پہچان بن چکی ہے اپنے استغناء کا بھرپور اظہار کیا، سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ درج ذیل پیراگراف اسی قلم سے نکل سکتا ہے جو مصلحتوں سے خالی، مفادات سے بالا، لومۃ لائم سے بے پروا، حق بیانی کے لئے کوشاں اور تعمیر ملت کا ترجمان ہو، اگر اس مقام تک نہیں پہنچا جا سکتا کہ ہر رتبہ ہر کسی کے لئے مقدر نہیں تو ان کی تقلید تو کی ہی جا سکتی ہے، دیکھئے اور عبرت حاصل کیجئے، اس جشن اور اس کے باوقار اور معزز مجمع کو ذہن میں رکھ کر یہ الفاظ پڑھیے:

''ہندوستانی مسلمان خدا کے فضل سے بڑی حد تک اسلام کے معاملہ میں خود کفیل ہیں، وہ اسلام کے اولیں و حقیقی سرچشموں کتاب وسنت اور اسلام کے اولین علمبرداروں کی سیرت و کردار، ان کی قربانی و ایثار اور ان کی اولوالعزمی و حوصلہ مندی کی جلائی ہوئی شمع سے روشنی حاصل کرتے ہیں، انہوں نے اپنا عقیدہ و ایمان، اپنا حال و مآل، اسلام کے چمکتے ہوئے سورج کے ساتھ وابستہ کیا ہے، مسلم اقوام یا عرب ممالک کے ابھرتے ڈوبتے ستاروں یا ٹمٹماتے چراغوں سے نہیں، وہ آنکھ بند کر کے ان میں سے کسی کی انگلی پکڑ کر چلنے والے نہیں ہیں، نہ انہوں نے ان میں سے کسی کی اسلام کے ساتھ وفا شعاری کو اپنی وفا شعاری کی شرط قرار دی ہے، انہوں نے اللہ کے بھروسہ پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان کو اسلام اور اسلامی تعلیمات کو اپنے سینہ سے لگائے رکھنا ہے، خواہ دنیا کی کوئی قوم (عرب ہو یا عجم) اس سے بے تعلقی یا روگردانی اختیار کرے، اگر عرب یا دوسرے ممالک کے مسلمان اپنی پرانی تہذیبوں اور قدیم فلسفوں کے سحر میں گرفتار ہو جاتے ہیں، اور ان کا دم بھرنے لگتے ہیں، تو ہم انشاء اللہ وحدتِ اسلامی اور شریعتِ اسلامی کا دم بھرتے رہیں گے، ہم اسلامی اصولوں اور اسلام کے مسلکِ زندگی کے معاملہ میں کسی قسم کا سودا کرنے کے لئے تیار نہیں۔

ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ہمیں اس ملک میں اور اس ملک کے باہر اپنی اس اصول پسندی اور وفا شعاری کی قیمت ادا کرنی پڑے گی، ہمیں بہت سے ان منافع و مواقع سے آنکھیں بند کرنی پڑیں گی، جو ہوا کے رخ پر چلنے والی ملتوں اور فرقوں کو حاصل ہوتے ہیں، لیکن ہمارا یقین ہے کہ ہمارا خدا اگر ہم سے راضی ہے، اور ہم خلوص وفہم کے ساتھ اپنے اصولوں پر قائم ہیں تو ہمارے لئے کوئی تنگی اور ہماری قسمت میں محرومی نہیں لکھی ہے، اس لئے کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ یہ ساری کائنات ارادۂ الٰہی کے تابع ہے، اور اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوتا، ہمارا مسلک اور ہمارا عقیدہ ہے کہ ؎

گلہ نہیں جو گریزاں ہیں چند پیمانے
نگاہِ یار سلامت! ہزار میخانے

(کاروان زندگی ج۲ص۱۸۸)

بے لوثی: عموماً انسان کسی نہ کسی مصلحت کا شکار ہو ہی جاتا ہے، اگر چہ وہ مفادات اور دیگر الجھنوں سے آزاد ہو، لیکن حضرت مولانا اس بلندی پر پہنچ چکے تھے جہاں سے ہر شے اپنی اصل حقیقت کے ساتھ نظر آیا کرتی ہے اور آنکھ کی زنگاری ختم ہو جایا کرتی ہے، اسی لئے جب ان کو موقع مل جایا کرتا تو پھر وہ تمام مصالح سے بالاتر ہو کر صاف صاف باتیں کرتے اور کلیجہ نکال کر رکھ دیا کرتے، اس صراحت کا راز خود ہی مولانا کے قلم پر آ گیا، پاکستان کی تقریروں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' ان تقریروں میں جن ممتاز شہریوں، دانشوروں، ماہرین تعلیم، علمائے کبار، صحافیوں، اور سوشل کام کرنے والوں کی بڑی تعداد بالعموم شریک ہوئی، اسلامی تاریخ کے مطالعہ، زندگی کے تجربوں، اپنے محدود فکر ونظر اور اپنے حقیر خلوص کا عطر رکھ دیا گیا، جس کے پیچھے نہ کوئی سیاسی غرض تھی، نہ کسی اچھے برے ردعمل کی فکر، بقول غالبؔ (ایک لفظ کی تبدیلی کے ساتھ)

نہ ستائش کی تمنا نہ گلہ کی پروا'' (کاروان زندگی ج۲ص۲۶۰)

بے لوثی کے اثرات: مولانا کی زندگی میں متعدد ایسے مراحل ہے جب ان کو متعدد سیاسی شخصیات اور وزرائے اعظم و غیرہ سے تنہا ملاقات کرنی پڑی، کسی شخص کی بات میں وزن تب ہی ہوتا ہے جب وہ مخلص و بے لوث ہو، اس کے اقدام اور اس کی بات کے پیچھے اس کا کوئی مفاد نہ ہو، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا یہ خاص امتیاز ہے کہ انہوں نے کبھی بھی اپنا کوئی ادنی سا مفاد بھی کسی ملی کوشش سے وابستہ نہ کیا، یہی وجہ تھی کہ ان کے قول میں وزن اور ان کا اقدام انقلاب آفریں ہوتا تھا، آج یہی چیز مفقود ہے جس کے سبب ہماری کسی بھی کانفرنس احتجاج اور تحریک کا اثر نہیں پڑتا، کیونکہ کہیں نہ کہیں ملی و اجتماعی کوششوں کے پیچھے ذاتی مفادات ضرور ہوتے ہیں، شاہ بانو کیس کے سلسلہ میں جب مولانا نے وزیر اعظم سے ملاقات کی تو اس سلسلہ کو قلم بند کرتے ہوئے یہ اعتراف کیا ہے کہ بے لوثی و اخلاص ہی بات میں وزن پیدا کرتا ہے:

''اسلئے اللہ تعالی پر اعتماد اور دعا وانابت کے سوا کوئی زاد راہ نہ تھا، الحمد اللہ کہ ان کوششوں سے میرا مقصد کسی شخصی یا سیاسی مفاد کی تکمیل اور حصول وجاہ ومنصب نہیں تھا، میں نے ہر ملاقات میں اسکا صاف اثر دیکھا'' (کاروان زندگی ج۳ص۱۳۲)

☆☆☆ (.....جاری)

❑ علوم و فنون

علم تجوید وقراءت، اہمیت اور ضرورت: ایک جائزہ

بصیرت فاطمہ (ریسرچ اسکالر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

قرآنِ کریم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جس عظمت وشان کے ساتھ جبرئیلؑ پہنچا رہے تھے، اسی عظمت شان سے اس کو پڑھنا بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ السلام کو سکھایا۔ اسی لیے رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنِ کریم کی صحیح تلاوت کرنے کے لیے ارشاد فرمایا ہے کہ :

"اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ اَنْ يُّقْرَءَ الْقُرْآنُ كَمَا اُنْزِلَ" [1]

"یعنی اللہ پسند کرتا ہے کہ قرآن اسی طرح پڑھا جائے جس طرح وہ نازل کیا گیا"۔

اور آپؐ نے سچ فرمایا کیونکہ عربی زبان بے حد حساس زبان ہے، کسی اور زبان کے حروف والفاظ اور ان کی اصوات اور طریقہ اداء میں اگر کچھ فرق ہوجاتا ہے تو اس سے معنی اور مفہوم میں کچھ زیادہ بگاڑ نہیں پیدا ہوتا۔ برخلاف اس کے کہ عربی زبان کے کسی حرف کا مخرج بدل جائے یا کسی حرف کی صفت میں تغیر ہوجائے یا بے موقع ادا کردیا جائے تو معنی میں زبردست تغیر ہوجاتا ہے۔ بامعنی لفظ بے معنی اور مہمل ہوکر رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر 'حَمَّالَةَ الْحَطَبْ" میں اَلْحَطَبْ، بالتاء پڑھ دینے سے نماز فاسد ہوجاتی ہے۔ اسی طرح سورہ فاتحہ میں اَنْعَمْتَ اگر اَنْعَمْتُ پڑھ دیا جائے تو اس تغیر سے معنی کا فساد ظاہر ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ حروفِ قرآنیہ کی ادائیگی اور تلفظ کے سلسلہ میں کسی طرح آزاد نہیں چھوڑا جاسکتا۔ اس لیے اس کی تلاوت وقراءت کے لیے باقاعدہ اُصول وضوابط مقرر ہوئے۔ ان اُصول وضوابط کی رعایت سے حروفِ قرآنیہ کی ادائیگی ٹھیک اسی طرح ہوجاتی ہے جس طرح پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے اور انھی اصول وقواعد کا نام علم تجوید ہے۔

اللہ رَبُّ العزت نے قرآنِ کریم ترتیل کے ساتھ نازل فرمایا ہے۔ ارشادِ باری ہے :

وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيْلًا (سورہ الفرقان، آیت:۳۲) "اور ترتیل ہی کے ساتھ اس کی تلاوت وقراءت کا حکم بھی فرمایا ہے، ارشاد باری ہے:

وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيْلًا (سورہ المزمل، آیت:۴) "یعنی قرآن کو ترتیل کے ساتھ پڑھو"

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تجوید وقراءت کی رعایت سے قرآن کی تلاوت کرتے تھے۔ نیز خوش الحانی سے خود بھی تلاوت کرتے تھے اور اپنی اُمّت کے لیے بھی ارشاد فرمایا کہ :

" زَيِّنُوا الْقُرْآنَ بِاَصْوَاتِكُمْ " [2] "قرآن کو اپنی آوازوں سے زینت بخشو"۔

نیز قرآن کی تلاوت کو انسان کے لیے بہترین عبادت قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے بغیر سمجھے ہوئے بھی اس کے مبارک الفاظ کی تلاوت پر بے پناہ حسنات اور

اجروثواب کا وعدہ فرمایا۔ارشادِ رسالت ہے:

"مَنْ قَرَأَ حَرْفًا مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ فَلَهُ بِهِ حَسَنَةٌ وَالْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا، لَااَقُوْلُ الٓمٓ حَرْفٌ وَلٰكِنْ اَلِفٌ حَرْفٌ وَلَامٌ حَرْفٌ وَمِيْمٌ حَرْفٌ" ۳

"جس نے پڑھا اللہ کی کتاب سے ایک حرف اس کے لیے ایک نیکی ہے اور ہر نیکی کا ثواب دس گنا ہے۔ میں نہیں کہتا ہوں کہ الف لام میم ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے، میم ایک حرف ہے اور لام ایک حرف ہے۔ یعنی الف لام میم کہتے ہی تیس (۳۰) نیکیوں کا اَجر ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے

"خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ" ۴ "تم میں سب سے بہتر ہے جو قرآن پڑھائے اور پڑھے۔"

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں سے ایک بڑی تعداد نے قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین تلامذہ اور شاگرد جنہوں نے مہبطِ وحی الٰہی سے قرآنِ کریم سیکھا۔ ان میں مہاجرین وانصار کی ایک بڑی تعداد نظر آتی ہے۔ جنہوں نے مذکورہ حدیث کو سننے کے بعد قرآن کریم کی خدمات کو اپنا خصوصی مشغلہ بنالیا، حضراتِ صحابہؓ کے شغف واشتغال بالقرآن اور مہارت کے سلسلہ میں احادیث اور کتبِ سیر وتاریخ میں جن گراں قدر حضرات کے اسماء گرامی ملتے ہیں، وہ اٹھائیس (۲۸) شخصیات ہیں، ان کے نام حضرات حسبِ ذیل ہیں :

مہاجرین میں :

(۱) حضرت ابوبکرؓ (۲) حضرت عمرؓ (۳) حضرت عثمانؓ (۴) حضرت علیؓ (۵) حضرت طلحہؓ (۶) حضرت سعدؓ (۷) حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ (۸) حضرت حذیفہؓ (۹) حضرت سالمؓ (۱۰) حضرت ابوھریرہؓ (۱۱) حضرت عبداللہ ابن عمرؓ (۱۲) حضرت عبداللہ ابن عباسؓ (۱۳) حضرت عمرو بن العاصؓ (۱۴) حضرت عبداللہؓ (۱۵) حضرت معاویہؓ (۱۶) حضرت ابن یزیدؓ (۱۷) حضرت عبداللہ بن السائبؓ (۱۸) حضرت عائشہؓ (۱۹) حضرت حفصہؓ (۲۰) حضرت ام سلمہؓ۔

انصار میں :

(۲۱) حضرت ابی بن کعبؓ (۲۲) حضرت معاذ ابن جبل (۲۳) حضرت ابودرداءؓ (۲۴) حضرت زید بن ثابت (۲۶) حضرت ابوزیدؓ (۲۷) حضرت مجمع بن جاریہؓ (۲۸) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم اجمعین ۵

مذکورہ تمام صحابہ کے علاوہ بھی دیگر بہت سے صحابہؓ نے علم تجوید وقراءت سے قرآن کی تلاوت کرنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا اور اسی انداز پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے تابعین عظام کو قرآن سکھایا۔ اسی وجہ سے علماء کرام نے "خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ" ۴ حدیث کے بارے میں لکھا ہے کہ قرآن کریم کے پڑھنے پڑھانے والوں کی فضیلت میں اگر صرف یہی ایک حدیث ہوتی تو کافی تھی، مذکورہ حدیث بخاری کے راوی اوّل حضرت عثمانؓ بن عفّان کے شاگرد اور آپ سے اس حدیث کی روایت کرنے والے حضرت ابوعبدالرحمٰن السلمی اونچے درجہ کے بڑے کثیر العلم تابعی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں ؛

"هٰذَا الَّذِيْ اَقْعَدَنِيْ مَقْعَدِيْ هٰذَا يُشِيْرُ اِلٰى كَوْنِهٖ جَالِسًا فِي الْمَسْجِدِ الْجَامِعِ بِالْكُوْفَةِ الخ" ۶

یعنی یہ وہ روایت ہے جس نے مجھے اس جگہ جامع کوفہ میں بٹھا رکھا ہے۔ اس حدیث کو سننے کے بعد آپ نے نہایت کثیر العلم ہوتے ہوئے بھی سب مشاغل سے الگ ہوکر صرف قرآن کریم کی تعلیم کے لیے خود کو وقف کردیا اور اس کے بعد چالیس سال سے

زیادہ طویل عرصہ تک قرآن کریم ہی پڑھایا۔

اسی وجہ سے صحابہؓ نے اسی انداز سے قرآنِ مجید کو پڑھا اور پڑھایا، نیز وہ کلام اللہ کی تلاوت میں ایک معمولی تبدیلی کو بھی برداشت نہیں کرتے۔ یہ معلوم ہے کہ حروفِ مد کو ان کی اصلی ومقررہ مقدار سے نہ پڑھنے سے تلاوت کا حسن ختم ہوجاتا ہے، معنیٰ نہیں بدلتے۔اس پر بھی حضرت ابن مسعودؓ کی کلامُ اللہ سے محبت وتلاوت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی تڑپ دیکھئے:

''كَانَ ابْنِ مَسْعُوْدٍ يُقْرِئُ رَجُلاً فَقَرَأَ الرَّجُلُ، اِنَّمَاالصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنَ، مُرْسِلَةً فَقَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍؓ مَاهٰكَذَا اَقْرَأَنِيْهَارَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. فَقَالَ كَيْفَ اَقْرَءُ كَهَايَااَبَاعَبْدِ الرَّحْمٰنِ؟ فَقَالَ أَقْرَانِيْهَا اِنَّمَاالصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْن فَمَدُّ هَا''.

''یعنی حضرت ابن مسعودؓ ایک شخص کو قرآنِ پاک پڑھا رہے تھے، پڑھنے والے نے للفقراء کو بغیر مد کے پڑھا، اس پر حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح نہیں پڑھایا، اس شخص نے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو کس طرح پڑھایا۔آپؓ نے پڑھ کر للفقراء پر مد کر کے بتایا۔''

محقق ابن الجزریؒ اسے النشر فی القراءات العشر میں نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں :

''هٰذَا حَدِيْثٌ جَلِيْلٌ حُجَّةٌ وَنَصٌّ فِيْ هٰذَا الْبَابِ وَرِجَالُ اِسْنَادِهٖ ثِقَاتٌ.'' ۷

''یعنی یہ جلیل القدر حدیث پورے باب المدات کے سلسلے میں دلیل وحجت ہے، اس حدیث کے تمام راوی اور ناقلین ثقہ اور معتبر ہیں۔

جس لفظ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھینچ کر پڑھتے یا جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم، وقف کرتے تو صحابہؓ بھی اس کو بالکل اسی طرح ادا کرتے اور اس کو یہاں تک تفصیل سے یاد کرتے کہ کس جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وقف یعنی سانس توڑ کر کیا، اور کہاں بغیر سانس توڑے، اور دوسروں کو بھی بتاتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لفظ یا اس حرف کو اس طریقہ سے ادا کیا ہے تاکہ وہ بھی اسی طریقہ سے پڑھیں اور پڑھائیں۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا جب یہ فرمان ملا کہ :

بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ (المائدہ، آیت:٦٧) ''پہنچادیجئے جو آپ پر نازل کیا گیا۔'' نیز دوسرا فرمان باری تعالیٰ یہ ہے کہ :

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَر (الحجر، آیت:۹۴) ''جو حکم دیا گیا اس کی تعمیل کیجئے۔''

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان احکام کے ملتے ہی ان کے پہنچانے میں سعی بلیغ فرمائی۔ چنانچہ قرآن مجید کو نورِ نبوت کی روشنی وطرز ادا پر پڑھنا اور سمجھنا ضروری ہے۔ اسی لیے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تعلیمِ قرآن کے انتظام کے لیے صفہ کی درس گاہ تھی۔ ایک اصحاب ذکر وفکر کا حلقہ، دوسرا قراء کا۔قراء کی تعلیم حضرت عبادہ بن صامتؓ کے سپرد تھی، جو حفاظ میں خاص طور سے ممتاز اور درسگاہِ صفہ کے معلم تھے۔

''آپؓ قرآن اور کتابت کی تعلیم دیا کرتے تھے، جن لوگوں کو دن کے وقت فرصت نہیں ملتی ان کے لیے رات کو سیکھنے کا موقع تھا۔ جب رات ہوجاتی تو وہ لوگ مدینہ کے ایک معلم کے پاس جاتے اور صبح تک پڑھنے میں مشغول رہتے۔'' ۸

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا ہے :

''رُبَّ قَارِيٍ لِّلْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ يَلْعَنُهٗ''. ۹

''یعنی بعض لوگ قرآن کی تلاوت اس حال میں کرتے ہیں کہ قرآن ان پر لعنت کرتا ہے۔ زمانہ ہٰذا میں سبھی اہل علم کو معلوم ہے کہ اتنا علم تجوید سیکھنا فرضِ عین ہے کہ جس سے کلامُ اللہ کی صحت ہوسکے،

اور پورے علم تجوید کا سیکھنا فرض کفایہ ہے۔ واقعی جو شرف وفضیلت اور اہمیت علم تجوید کی ہے وہ اہل علم سے چھپی نہیں ہے پھر بھی ہمارے اہلِ علم اس علم کو سیکھ کر حکم خداوندی کے آگے کما حقہ ادائیگی کی سعی میں کوتاہ نظر آتے ہیں، جبکہ حضرت ابوھریرہؓ کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کسی چیز کی طرف اتنا متوجہ نہیں ہوتا جتنا کہ خوش آوازی سے قرآن پڑھنے والے کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔'' [۱۰]

مذکورہ بالا مختصر اشارات سے علم تجوید وقراءت کی اہمیت ضرورت، فوائد کا اندازہ ہوگیا اور یہ بات واضح ہوگئی کہ علم تجوید ہمیں اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ حروف صحیح طریقے سے اور مقررہ مخارج سے ادا کیے جائیں، اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ قرآن مجید کی تلاوت اس کے حسن کے مطابق ہوگی اور ہر فرد تلاوتِ قرآن مجید کے دوران ہر قسم کی غلطیوں سے محفوظ رہے گا۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت میں کامیابی وکامرانی نصیب ہوگی۔ بہت سے لوگ تلاوت اس زعم سے کرتے ہیں کہ وہ بہت اعلیٰ تلاوت کر رہے ہیں اور انہیں کسی کے پاس جا کر سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اکثر مشاہدے میں آیا ہے کہ جو لوگ بزعم خود یہ سمجھتے ہیں کہ وہ صحیح تلاوت کر رہے ہیں۔ کافی اصلاح کے طالب تھے۔ نیز مذکورہ سطور سے یہ بات بھی واضح ہوگئی ہے کہ تجوید وقراءت منزّل من اللہ ہے، جس کو خود رسول اللہ اور آپ کے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے سیکھا اور سکھایا، اور ہماری نماز ودعا کی مقبولیت کے لیے بھی اشد ضروری ہے۔ لہٰذا آج ہی اللہ تعالیٰ سے عہد کریں کہ روزانہ ایک رکوع یا چند قرآنی آیات تجوید کے قواعد کے مطابق پڑھیں گے کیونکہ صحیح تلاوتِ قرآن افضل العبادات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ ہمیں تجوید سے قرآن مجید پڑھنے، اسے سمجھنے، عمل کرنے اور دوسروں تک اس کی تعلیم پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

حواشی:

۱ جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر السیوطیؒ، جمع الجوامع اوجامع الصغیر، جلد دوم، ص:۲۷۲، حدیث نمبر ۵۵۹، طبعۃ اولیٰ ۱۴۲۱ھ

۲ محمد بن اسماعیل بخاری، صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم، جلد دوم، ص:۱۱۲۶، مطبع، اصح المطابع۔

۳ محمد بن عیسی، ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فی من قرأ حرفا من القرآن مالہ من الاجر، جلد دوم، ص:۱۱۵، مطبع، کتب خانہ رشیدیہ، دہلی

۴ محمد بن اسماعیل بخاری صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ، جلد دوم، ص:۷۵۲، مطبع، اصح المطابع۔

۵ ابن الجزری، النشر فی القراء اتِ العشر، جلد اول، ص:۶، دارالفکر

۶ علامہ ابی الخیر الجزری، النشرؒ فی القراء ات العشر، جلد اول، ص:۳، مطبع، دارالفکر۔

۷ علامہ الجزریؒ، النشر فی القراءاتِ، جلد اول، ص:۳۱۵، ۳۱۶، مطبع، دارالفکر۔

۸ کرنل مرزا نسیم بیگ، تذکرہ قاریانِ ہند، جلد اول، ص:۵

۹ ابن حاتم الرازی، تفسیر بالمأثور، جلد۔۵، ص:۲۵۹، حدیث نمبر ۱۱۶۳۴، الطبع اولی، ۱۴۲۷ھ، مطبع دارالکتاب العلمیہ، بیروت، لبنان۔

۱۰ سنن ابی داؤد، باب کیف یستحب الترتیل فی القراءۃ، ص:۲۵۳، مطبع محمد ناصر الدین البانی۔

☆☆☆

□ قضیۂ فلسطین

مسجدِ اقصیٰ اور ہماری ذمہ داریاں

محمد حماد کریمی ندوی
(ناظم المعہد الاسلامی العربی، مرڈیشور، بھٹکل)

فلسطین یا بیت المقدس وہ سرزمین ہے جس کے بابرکت ہونے کی گواہی قرآن نے دی ہے، یہی وہ سرزمین ہے جہاں کا سفر مسلمانوں کے لئے فخر اور درجات علیا کے حصول کا ذریعہ ہے، یہی وہ سرزمین ہے جس میں مسلمانوں کے لئے مسجد اقصیٰ، عیسائیوں کے لئے بیت اللحم اور یہودیوں کے لئے دیوار گریہ کی اہمیت کسی پر پوشیدہ نہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ شہر ان تینوں مذاہب کے مابین ہمیشہ کشمکش کا مرکز بنا رہا ہے، انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں لکھا ہے کہ یہ شہر ۳۳ صدی پرانا ہے، آپ کو تعجب ہوگا کہ اتنا قدیم شہر اپنی تاریخ میں بہ مشکل بیس سال ایسے رکھتا ہے، جن کے دوران یہاں کے باشندوں کو امن نصیب ہوا، ورنہ نوع انسان کی خون آشام تاریخ یہاں اپنے آپ کو بار بار دہراتی رہی ہے، لیکن اس سے زیادہ حیرت میں ڈالنے والی بات یہ ہے کہ ان تمام واقعات کے باوجود اس کی تقدیس میں ذرہ برابر کمی نہیں ہوئی۔

تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ طوفانِ نوح کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے سام کی اولاد کے کچھ لوگ جزیرۃ العرب سے ہجرت کر کے ۲۵۰۰ ق م، اس سرزمین میں داخل ہوئے۔

اس کے بعد ۱۴۵۱ ق م، کو یوشع بن نون نے بیت المقدس پر حملہ کر کے وہاں کے بادشاہ اور اس کے معاونین کو شکست دی، اس طرح بنی اسرائیل کا اس شہر میں داخلہ ہوا، یہ وہ زمانہ تھا جب بنی اسرائیل اللہ کی محبوب قوم تھی، لیکن گردش زمانہ کے ساتھ یہ قوم اللہ سے دور ہوتی گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو ذلیل وخوار ہو کر وہاں سے نکلنا پڑا، یہاں تک کہ ان کی منشاء کے مطابق ۱۰۲۰ ق م، میں طالوت کو ان کا بادشاہ بنایا گیا، جس کا مقابلہ مشرکین کے سردار جالوت سے تھا، مقابلہ کے دوران ایک نوجوان نے بڑی بہادری کا مظاہرہ کر کے جالوت کو قتل کیا، قرآن کی وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نوجوان حضرت داؤد علیہ السلام تھے۔

طالوت کے بعد بنی اسرائیل نے حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنا بادشاہ بنایا، انہوں نے اپنی قوم کو لے کر شہر بیت المقدس پر حملہ کیا اور اس کو فتح کر کے اس کا نام مدینہ داؤد رکھا، پھر ان کے جانشین حضرت سلیمان علیہ السلام کی عظیم و بارعب سلطنت کے بعد بنی اسرائیل دو حصوں میں تقسیم ہو کر باہم دست و گریباں ہو گئے، یہاں تک کہ ۵۶۹ ق م میں بخت نصر نے یکے بعد دیگرے دو حملے کئے، جس میں اس نے ہیکل سلیمانی کو بنیاد سے ختم کر دیا، جب وہ واپس جا رہا تھا تو شہر کا یہ عالم تھا کہ پورا شہر راکھ سے بھرا ہوا تھا، اور بچے ہوئے یہودی اس کے قیدی تھے، یہ یہودیوں کی پہلی تباہی تھی جس میں دیگر صحیفوں کے ساتھ توریت بھی غائب ہو گئی، اور تابوت سکینہ بھی غائب ہو گیا، جس کا سراغ آج تک نہ مل سکا۔

بخت نصر کے اس حملہ کے بعد پچاس برس تک یہ شہر ویران رہا، یہاں تک کہ بابل بن سالتی ایل نے جو حضرت داؤد علیہ السلام کی نسل سے تھا، صہیونیت کی تحریک کا آغاز کیا، صیہون دراصل بیت

المقدس میں ایک پہاڑی ہے، جس پر حضرت داؤد علیہ السلام نے جشن منایا تھا، اسی لئے یہودی اس کو مقدس سمجھتے ہیں، اس تحریک کا اصل مقصد کھوئی ہوئی ریاست کو دوبارہ حاصل کرنا ہے۔

۳۳۱ ق م کا زمانہ ہے، لگاتار یہودی سازشوں کے بعد بیت المقدس پر یہودیوں کا قبضہ ہو جاتا ہے، ابھی مختصر ہی عرصہ گذر پاتا ہے کہ ان کو خبر ملتی ہے کہ ایک بادشاہ پے در پے فتوحات کے ساتھ بیت المقدس کی طرف بڑھا چلا آرہا ہے، اب اس کو یہودیوں کی بزدلی کہیں یا عیاری کہ انہوں نے مقابلے کے بجائے اس بادشاہ کا استقبال کیا، یہ وہی بادشاہ ہے جس کو دنیا سکندر اعظم کے نام سے جانتی ہے، اس کی موت کے بعد یہ شہر یونانیوں کے قبضہ میں آ گیا۔

اس کے بعد یہ شہر مختلف ادوار سے گذرتا رہا، یہاں تک کہ اللہ کے نبی حضرت عیسی علیہ السلام اس شہر میں تشریف لاتے ہیں، اور یہودیوں کو بار بار اللہ کی عبادت واطاعت کی دعوت دیتے ہیں، لیکن ان کے مسلسل کفر وانکار کی وجہ سے ان کے آسمان پر اٹھا لئے جانے کا واقعہ پیش آتا ہے، اس واقعہ کے بعد سے لے کر ۲۲۸ء تک عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان جنگیں ہوتی رہتی ہیں، یہ زمانہ عیسائیوں کے لئے سخت ابتلاء وآزمائش کا ہوتا ہے، پھر عیسائیوں کو تائید غیبی حاصل ہوتی ہے، اور ۳۳۶ء میں قیصر روم قسطنطین عیسائیت قبول کر لیتا ہے، اور بیت المقدس کو عیسائی ریاست میں شامل کر لیتا ہے، پھر اس کے بعد دو صدی تک یہ عیسائیوں کا مرکز رہتا ہے، یہاں تک کہ ۶۲۸ء کے بعد تاریخ کا وہ زریں باب شروع ہوتا ہے جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

بیت المقدس پر یہود وعیسائی دونوں اپنا حق ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جب تک وہ حق پر تھے وہی اس کے مستحق تھے، لیکن جب ان سے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانیاں سرزد ہوئیں، اور وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہوئے، تو اللہ نے ان سے یہ نعمتیں چھین لیں، اور امت مسلمہ توحید ورسالت کی علمبرداری کی حقیقی وارث قرار پائی، یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ بعثت محمدی ﷺ دراصل حضرت ابراہیم واسمعیل، اسحٰق ویعقوب، داؤد وسلیمان اور موسی وعیسی علیہم السلام کی آخری کڑی ہے، لہٰذا امت مسلمہ ہی اس سرزمین کی اصل واارث اور وہی اس کی حقدار ہے، انہی تمام باتوں کے پیش نظر اس مبارک سرزمین پر جو صدیوں سے خون کا میدان بنی ہوئی تھی متبعین اسلام کا پرامن داخلہ ہوتا ہے، اور بغیر کسی مقابلہ کے یہ شہر مسلمانوں کے قبضہ میں آجاتا ہے، اور اس کی چابیاں خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کے حوالے کی جاتی ہیں، اس طرح یہ شہر امن وامان کا گہوارہ بن جاتا ہے، اس فتح کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ فاتح قوم کے ساتھ مفتوح قوم بھی فتح کا جشن مناتی ہے۔

جس طرح مسلمانوں نے بیت المقدس کی پرامن فتح دیکھی، اسی طرح اس شہر پر ۵/ جولائی ۱۰۹۵ء کا وہ سیاہ دن بھی آیا جب صلیبیوں نے ظلماً مسلمانوں سے اس شہر کو چھین لیا، اور نوے سال تک ظلم وبربریت کا وہ وحشت ناک مظاہرہ کیا کہ حضرت شیخ سعدی شیرازیؒ فرماتے ہیں کہ جو عیسائی اس حملہ کے لئے بیت لمقدس میں داخل ہوئے انہیں انسان کہنا انسانیت کی توہین ہے۔

اس کے بعد مسلمانوں اور صلیبیوں کے درمیان جنگیں اور جھڑپیں ہوتی رہیں، پھر بیت المقدس نے اپنی تاریخ میں وہ مبارک دن بھی دیکھا جب بروز جمعہ ۲۷/ رجب ۵۸۳ھ مطابق ۱۳/ اکتوبر ۱۱۸۷ء کو صلاح الدین ایوبی فاتح بن کر اس شہر میں داخل ہوتے ہیں، اس طرح بیت المقدس پھر ایک بار مسلمانوں کے قبضہ میں آجاتا ہے، لیکن صلیبی جنگوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے، پھر جب ۱۹۱۷ء میں پہلی جنگ عظیم کے بعد خلافت عثمانیہ کا شیرازہ بکھر جاتا ہے، تو برطانیہ بیت المقدس کو برٹش کنٹرول میں لے کر یہودیوں کے قبضہ میں دے دیتا ہے، رفتہ رفتہ یہودی پورے بیت المقدس پر قابض ہوجاتے ہیں، اور مسجد اقصی وقبۃ الصخرۃ دونوں یہودیوں کے تسلط میں چلا جاتا ہے، (..... **بقیہ صفحہ نمبر ۵۷ پر**)

□ سوانح

مولانا عاشقِ الٰہی میرٹھی، اردو کے صغیر سن مترجم و مفسرِ قرآن

ندیم احمد انصاری
(لیکچرر شعبۂ اردو، اسماعیل یوسف کالج، ممبئی)

مولانا عاشقِ الٰہی بن یادِ الٰہی بن رحمِ الٰہی بن فضلِ الٰہی کی ولادت 5 رجب 1299ھ مطابق 3 جون 1881ء یومِ جمعہ کو میرٹھ میں ہوئی۔ چار سال کی عمر میں 'الف، ب' شروع کی اور سال بھر تک مکتب میں پڑھتے رہے، اور فقط چھ سال کی عمر میں 'مرأۃ العروس' اور 'بنات النعش' و 'توبۃ النصوح' ختم کر لی، جو فی زمانہ ایم اے اردو وغیرہ کے نصاب میں شامل ہے۔ اسی مدّت میں ریاضی بھی سیکھی اور اربعہ وستہ کے سوال حل کرنے لگے۔ چھ مہینے میں کلام اللہ ختم کیا اور 1305ھ میں جب کہ عمر چھ سال ہوئی مولوی نوراللہ سے جو کہ نہایت متوکل و متقی بزرگ تھے، عربی شروع کر دی۔ چند مہینے میں 'میزان منشعب' پڑھنے پر استعداد اتنی ہوگئی کہ مولانا تلاوت کرتے ہوئے قرآن مجید کے صیغے ان سے دریافت کرتے اور وہ بتاتے رہتے۔ فارسی اس وقت تک بالکل نہیں پڑھی تھی، اس لیے مولانا کے مشورے پر مولوی عباس علی سے 'آمدنامہ' شروع کیا اور چند مہینے میں 'گلستان'، 'بوستان' تک پڑھ لیا۔ مولانا کی ذہانت دیکھ کر ان کے ماموں منشی وزارت علی، جو کہ تحصیلی اسکول میں مدرسِ دوم تھے، اردو مڈل پاس کرانے کے شوق میں مولانا کو اپنے ساتھ لے گئے اور چوتھی جماعت میں ان کا نام لکھوا دیا۔ دو سال تک ان سے تعلیم حاصل کرتے رہے اور پھر دو سال صدر المدرسین منشی یعقوب علی کے پاس تعلیم پا کر 1310ھ مطابق دسمبر 1892ء کے امتحانِ مڈل میں شریک ہوگئے۔ جس طرح اس سے قبل کسی امتحان میں ناکامی نہیں ہوئی تھی، اسی طرح ورنیکلر مڈل میں بھی ناکام نہ رہے اور فقط ساڑھے گیارہ سال کی عمر میں مڈل کی سند حاصل کر لی۔ اس کے بعد چھ مہینے تک پھر فارسی پڑھی اور حافظ امداد حسین سے مضمون نویسی کی مشق کرتے رہے۔

اس وقت 'مشن اسکول' میں ایک درجہ کھولا گیا تھا، جس میں مڈل پاس بچّوں کو داخل کر کے صرف انگریزی زبان کی تعلیم دی جاتی اور دو سال میں انگریزی مڈل کا امتحان دلانے کا اعلان تھا، چناں چہ مولانا بھی اس میں داخل ہوگئے، مگر اس جماعت میں اتنے طلبہ نہ آئے جن کی فیس سے مدرس کی تنخواہ نکل سکتی، اس لیے چھ مہینے بعد ہی وہ درجہ ٹوٹ گیا اور مولانا فیضِ عام اسکول' کی ساتویں جماعت میں داخل ہوگئے۔ داخلے کو چوتھا دن تھا کہ استاد نے ایک معمولی غلطی پر اسکول کے رواج کے موافق انھیں بینچ پر کھڑا کر دیا اور ہتھیلی پر دو رول مارے، چوں کہ عمر بھر میں یہ پہلا اتفاق تھا اس لیے ان کی غیرت نے ضرورت سے زیادہ اس کا اثر لیا اور گھر آ کر والدہ سے رو کر کہا کہ مجھے عربی شروع کروادو، میں اسکول کی تعلیم کے قابل نہیں ہوں۔ چناں چہ وسط جمادی الثانیہ 1311ھ مطابق دسمبر

1893ء میں، جب کہ ان کی عمر تیرہ سال تھی 'مدرسہ قومی، میرٹھ' میں داخلہ لیا اور مولانا عبدالمومن صاحب دیوبندی سے جو کہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ کے بہنوئی تھے 'میزان' شروع کی۔ وسطِ شعبان میں مدرسے کا سالانہ امتحان ہوا تو مولانا صدیق احمد ممتحن نے 'میزان، منشعب' اور 'صرفِ میر' و 'نحوِ میر' کا از اول تا آخر امتحان لیا اور بے حد خوش ہو کر مولانا سے فرمایا کہ یہ طالبِ علم بہت ہونہار ہے، اس کو خاص توجہ سے پڑھانا۔ اس کے بعد مدرسے کی بڑی تعطیل ہوگئی، مگر رمضان میں مولانا قاری محمد اسحاق صاحب میرٹھی سے 'شرح مأۃ عامل' با ترکیب ختم کر لی۔

10 شوال کو مدرسہ کھلا اور مولانا کے شفیق استاد نے عربی کا ہشت سالہ نصاب بعض درمیانی غیر ضروری کتابوں کو حذف کر کے خاص طرز پر خاص توجہ کے ساتھ پڑھانا شروع کیا اور مولانا روزانہ چار پانچ کتابوں کا سبق زیادہ مقدرار میں لینے لگے، اس طرح سات مہینے میں صرف ونحو ختم ہوگئی۔ اب وقت آیا کہ چار طلبہ کا ہم جماعت بن کر حدیث شروع کر دیں، چناں چہ ربیع الثانی 1312ھ میں جب کہ ان کی عمر چودہ برس سے کم تھی اور عربی شروع کیے ہوئے دس مہینے گزرے تھے، 'مشکوٰۃ شریف' شروع ہوگئی، اور دو سال میں صحاحِ ستہ اور دینیات کی تمام کتابیں ختم ہوگئیں۔ آخری امتحان، جس میں 'بیضاوی شریف' بھی تھی مولانا میر احمد حسن صاحبؒ امروہوی نے لیا اور پرچۂ جوابات پڑھ کر خوشی سے فرمایا کہ گو معقول کی بعض کتابیں باقی ہیں مگر دینیات کی تعلیم ختم ہو چکی، اس لیے بے اختیار میرا دل چاہتا ہے کہ اتباعاً للاسلاف اس کی دستار بندی کر دوں، اور پھر ایسا ہی کیا۔ اس وقت مولانا کی عمر صرف سولہ سال کی تھی۔

اسی سال ماہِ ربیع الثانی 1315ھ میں مولانا کا نکاح ہو گیا اور نکاح سے تین ماہ بعد مدرسۂ قومی سے سندِ تکمیل لے کر 24 رجب 1315ھ مطابق 19 دسمبر 1897ء کو لاہور روانہ ہوئے۔ بڑے دن کی تعطیلات کے بعد 'اورینٹل کالج' کھلنے پر وہاں امتحان دے کر مولوی فاضل کلاس میں داخلہ لیا، جس کے پروفیسر مولانا مفتی محمد عبد اللہ صاحب ٹونکی تھے۔ 3 اپریل 1898ء مطابق 11 ذی قعدہ 1315ھ یومِ دوشنبہ سے امتحان شروع ہوا، جس کے پرچے چار دن میں ختم ہوگئے اور مولانا امتحان سے فارغ ہو کر اپنے خالو مظفر حسین صاحب کے پاس سیالکوٹ ہوتے ہوئے وطن آ گئے۔ سوا مہینے بعد 10 ذی الحجہ کو عین عید کے دن لاہور سے خط آیا کہ تم تمامی طلبہ سے اوّل رہے اور اتنے نمبروں سے کامیاب ہوئے کہ مفتی عبد اللہ صاحب کے بعد اتنے نمبر کبھی کسی طالبِ علم کے نہیں آئے یعنی 600 نمبروں میں 465۔

بعدہ مولانا محمد علی صاحب (ناظم ندوۃ العلماء) کے تقاضے پر مولانا لکھنؤ چلے گئے، جہاں جلسۂ انتظامیہ کے فیصلے پر 26 محرم 1317ھ سے ان کا تقرر ایک سو بیس روپئے مشاہرے پر دارالعلوم کی دوم مدرسی پر ہو گیا۔ چھ مہینے گزرے تھے کہ مولانا کے جسمانی و روحانی بزرگوں نے ان کی جسمانی دوری گوارا نہ کر کے قیامِ وطن پر مجبور کیا تو آخر رجب میں اس طرح رخصت ہوئے کہ طلبہ مولانا کی روانگی پر اور مولانا ان کی پریشانی دیکھ کر رو رہے تھے۔

ندوۃ العلماء، لکھنؤ کے بعد غالباً مولانا نے کسی ادارے میں مستقل تدریسی خدمات انجام نہیں دیں، بلکہ طباعت، تصنیف و تالیف اور تراجم کو اپنا مشغلہ بنالیا۔ لکھنؤ سے وطن آ کر کچھ روپیہ قرض لیا اور 12 جون 1900ء مطابق 14 صفر 1318ھ کو 'خیر المطابع' نامی مطبع کھولا، جس میں اجرت پر دینی کتابیں طبع کرانے لگے اور ساتھ ہی مفید کتابوں کے تراجم میں مشغول ہوگئے۔ سب سے اول

قرآن مجید کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا، متعدد تفاسیر وکتبِ معتبرہ سے مفید حواشی اس پر چڑھائے اور 1319ھ میں بہ صورتِ حمائل اس کو طبع کروایا۔ حق تعالیٰ نے اس کو مقبولیت بخشی اور وہ ہاتھوں ہاتھ ہدیہ ہوگیا۔ 1320ھ میں حمائل دوبارہ پہلے سے اچھی حالت میں طبع ہوئی اور اس کے ساتھ ہی سوانح محمدیہؐ جدید طرز پر مرتب کر کے 'اسلام' نام رکھ کر اسے طبع کروایا۔

1322ھ میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کے ارشاد پر امام غزالیؒ کی 'اربعین' کا ترجمہ کیا اور بہ نام 'تبلیغِ دین' اس کو طبع کرایا۔ اس کے ساتھ ہی بچوں کے لیے بلا ترجمہ نہایت صاف اور صحیح قرآن مجید طبع کیا۔ 2 محرم 1326 سے اپنے دینی بزرگوں کے ارشاد اور احباب کے اصرار پر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی سوانح مرتّب کرنی شروع کی اور شریعت وطریقت کے دو مستقل حصّے بنا کر بہ نام 'تذکرۃ الرشید' 30 ذی الحجہ 1326ھ کو شایع کر دیے ۔ 1327ھ میں حضرت ممدوح کے دستی خطوط جو بعض طالبین، سالکین کے نام گئے تھے، فراہم کر کے طبع کیے اور 'مکاتیبِ رشیدیہ' نام رکھا، جس میں اس خط کا بہ جنسہٖ فوٹو بھی شامل کیا جو شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب اور خلیفۂ اول مولانا خلیل احمد صاحب کے نام دیوبند گیا تھا۔

1331ھ میں مولانا کا کیا ہوا ترجمہ وحواشی بڑی تقطیعِ کلام مجید پر طبع ہوئے اور اسی درمیان میں 'قصۂ یوسف علیہ السلام' تالیف کیا، جو سورۂ یوسف کی شرح تھی۔ 1332ھ میں ایک ماہ وار مذہبی رسالہ سہارنپور سے نکالنے کی تجویز ہوئی اور مولانا کی ادارت ومضمون نگاری میں ربیع الاول سے بہ نام 'الرشاد' اس کا اجرا ہوا، مگر اس کی عمر ایک سال سے زیادہ نہ ہوئی اور صفر 1333ھ میں اس سے دست بردار ہونا پڑا۔ اسی درمیان میں رسالہ 'امداد السلوک' کا اردو ترجمہ 'ارشاد الملوک' کے نام سے طبع کروایا، اس کے بعد پیرانِ پیر کے مواعظ یعنی 'الفتح الربانی' کے ترجمے میں مشغول ہوگئے اور اسے نہایت سلیس ترجمہ کر کے حامل المتن بہ نام 'فیوضِ یزدانی' طبع کروایا۔ 1334ھ میں حمائل کے چوتھی مرتبہ طبع کی ضرورت ہوئی اور اس سے فارغ ہو کر اہلِ رنگون کی فرمائش پر 'البصائر' کا ترجمہ شروع کر دیا، جو 'الجواہر الزواہر' کے نام سے دو ہزار طبع ہوا اور وہیں تقسیم ہوگیا کہ اکثر شائق اس کی زیارت سے بھی محروم رہے۔ 1338ھ میں 'فیوضِ یزدانی' کے چالیس وعظ کی جدید طرز پر شرح لکھی، جو بہ نام 'انوارِ سبحانی' طبع ہوئی۔ 1340ھ میں 'فیوض' اور 'تبلیغ' کو نظرِ ثانی کے بعد طبع کروایا۔ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور ایک عظیم عالمی شہرت یافتہ دینی درس گاہ ہے، جس کی سرپرستی یقیناً قابلِ رشک اور عظیم منصب ہے، اس پر مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کے ایما وحکم پر مولانا 1344ھ میں فائز ہوئے اور رکنِ شوریٰ کی حیثیت سے تاحیات یعنی تقریباً سولہ سال تک اس منصبِ جلیل پر فائز رہے ، اور انھیں خدمات کو کرتے کرتے یکم شعبان 1360ھ بہ مطابق 25 اگست 1941ء بہ روز دوشنبہ، صبح چھ بجے انتقال فرما گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

صغر سن مفسر و مترجمِ قرآن:

نثری ہو یا منظوم، ترجمہ نگاری سہل نہیں بلکہ دِقت طلب اور صبر آزما کام ہے۔ کسی بھی فن پارے کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنے کے عمل کو لفظِ ترجمہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس کے ذریعے مترجم فن پارے میں معانی کے تمام پہلوؤں کے ابلاغ و ترسیل کی حتی المقدور کوشش کی جاتی ہے، محض لفظی ترجمہ کر دینا کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں ہوا کرتا اور معاملہ جب قرآن مجید کے ترجمے کا ہو تو احتیاط کا تقاضا اور بھی بڑھ جاتا ہے، اس لیے کہ اول تو

عربی زبان کی وسعت دوسرے کلامِ ربانی کی فصاحت و بلاغت، یہ دونوں باتیں غایت درجے احتیاط کی متقاضی ہیں، اس کے باوجود اغلب یہ ہے کہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ کو اردو زبان میں سب سے کم عمر مترجم ومفسرِ قرآن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ مولانا نے تقریباً انیس سال کی عمر میں یہ عظیم خدمت انجام دی، جس پر بعضوں کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ ان میں تو ترجمۂ قرآن کی صلاحیت ہی موجود نہ تھی، محض دنیوی منفعت کی خاطر انھوں نے یہ کام کیا، جیسا کہ پروفیسر مجیب اللہ قادری کا خیال ہے:

''مولوی عاشق الٰہی نہ تو کسی معروف مدرسے سے فارغ ہیں اور نہ اتنی دینی صلاحیت کے ماہر ہیں کہ 20 سال سے بھی کم عمر میں قرآنِ کریم کا اردو ترجمہ کرلیا، یقیناً یہ تعجب خیز عمل معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص جو صرف مولوی فاضل کی کتابیں پڑھا ہوا ہے، اس میں کہاں سے یہ استعداد آگئی کہ اس نے قرآن پاک کا صرف 20 سال کی عمر میں ترجمہ مکمل کرلیا۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ اپنا مطبع اس لیے قائم کیا کہ ترجمۂ قرآن کو زیادہ سے زیادہ شایع کیا جائے لیکن یہ ترجمہ عام لوگوں میں مقبول نہ ہوسکا۔ دوسرا تعجب یہ ہے کہ آپ نے اور کوئی قابلِ ذکر علمی تصنیف یادگار نہ چھوڑی جس سے آپ کی علمی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ ہوتا کہ واقعی آپ کم عمر میں ترجمۂ قرآن کرنے کے اہل تھے۔''

'اردو تراجمِ قرآن کا تقابلی مطالعہ' کے عنوان سے یہ تبصرہ درجِ ذیل ویب سائٹ ourdu.com پر نظر نواز ہوا، جس میں پروفیسر صاحب کے قائم کیے ہوئے مذکورہ بالا اعتراضات درجِ ذیل چند وجوہ سے درست معلوم نہیں ہوتے؛

(1) بلا تحقیق مولانا میرٹھی کی تعلیم و تربیت اور صلاحیتوں و کارناموں پر سوال اٹھایا جانا۔

(2) اول تو 'کسی مدرسے سے فارغ نہ ہونا' عدمِ صلاحیت پر دال نہیں، اصل فراغت نہیں بلکہ صلاحیت ہے، دوم مولانا نے دینی و درسی نصاب کی باقاعدہ تکمیل کی ہے، جس کا معترض کو شاید علم نہیں ہوسکا۔

(3) صرف مولوی فاضل کی کتابیں پڑھا ہوا' یہ دعویٰ بھی بلا دلیل ہے۔

(4) اپنا مطبع اس لیے قائم کیا کہ ترجمۂ قرآن کو زیادہ سے زیادہ شائع کیا جائے' یہ بھی محض الزام تراشی ہے، جو معترض کی پست ذہنی کی غماز ہے۔ اہلِ علم اس طرح کے بے بنیاد الزام نہیں لگایا کرتے جن میں کسی کی ذات واخلاص کو ہدف بنایا جائے اور جو بھی اشکال کرتے ہیں اس پر عقلی ونقلی دلائل قائم کرتے ہیں، جو یہاں ندارد ہیں۔

مذکورہ بالا اعتراضات کی حقیقت سمجھنے کے لیے اولاً مولانا کے وہ حالات جان لینا ضروری ہے، جو ہم ابتدا میں ذکر کر آئے ہیں، ثانیاً 'تذکرۃ المفسرین' کا یہ اقتباس ملحوظ رہے تو بہت سے اشکالات خود ہی رفع ہوجائیں گے:

''سولہ سال کی عمر میں درسِ نظامی کی کتابیں تکمیل فرما کر سندِ فراغت حاصل کر لی۔۔۔ دیگر تصانیف کے علاوہ قرآنِ عزیز کا ترجمہ اور حاشیہ لکھا جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ایک ایک کلمہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی نظر سے گزرا ہے۔'' (ص:323)

اس اقتباس میں پروفیسر قادری کے تمام اعتراض کا اجمالی جواب آ گیا اور واضح ہوگیا کہ:

(1) مولانا میرٹھی ایک باصلاحیت اور عالم فاضل شخص ہیں اور ابتدائے زندگی ہی سے انھیں علم کی فضا میسر آئی ہے۔

(2) دوسرے یہ کہ مولانا میرٹھی اس زمانے میں بھی ایک روشن خیال اور مختلف علوم وفنون میں دل چسپی رکھنے والے شخص تھے، عالم فاضل کی ڈگریاں حاصل کرنا ان کی اضافی خصوصیات ہیں۔

(3) تیسرے یہ ہے کہ 'اپنا مطبع اس لیے قائم کیا کہ ترجمۂ قرآن کو زیادہ سے زیادہ شائع کیا جائے' اس میں اگر ترجمۂ قرآن کی زیادہ سے زیادہ اشاعت سے شکایت ہے تو یہ اعتراض خود حیران کُن ہے اور اگر اعتراض یہ ہے کہ اپنا خود کا کیا ہوا ترجمہ زیادہ سے زیادہ شایع کرنا مقصود تھا تو اس میں بھی ہمیں چنداں حرج معلوم نہیں ہوتا، ہر مصنف و مترجم اپنی قلمی کاوشوں کے لیے کوئی پلیٹ فارم تلاش کیا کرتا ہے۔

(4) رہا یہ اعتراض کہ 'یہ ترجمہ عام لوگوں میں مقبول نہ ہوسکا' محض دعویٰ بلا دلیل ہے جو درست نہیں۔ اس لیے کہ اول تو مولانا میرٹھی کا بیان ہے:

سب سے اول میں نے قرآن مجید کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا، متعدد تفاسیر و کتبِ معتبرہ سے مفید حواشی اس پر چڑھائے اور 1319ھ میں بہ صورتِ حمائل اس کو طبع کرایا۔ الحمدللہ کہ حق تعالیٰ نے اس کو مقبولیت بخشی اور وہ ہاتھوں ہاتھ ہدیہ ہوگیا۔ 1320ھ میں حمائل دوبارہ پہلے سے اچھی حالت میں طبع ہوئی۔ (الجواہر الزواہر قدیم، ص:6)

دوسرے اگر پروفیسر صاحب کی بات مان بھی لی جائے تو اس کی اشاعت کا اہلِ علم وعوام کی طرف سے اصرار نہ ہونا چاہیے، جب کہ اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ حال ہی میں ایک بار پھر اس کی جدید اشاعت منظرِ عام پر آئی ہے، نیز پروفیسر محمد نسیم عثمانی کا بیان ہے:

''مولانا عاشق الٰہی میرٹھی [کا] اردو ترجمہ خیر المطابع، لکھنؤ میں 1320ھ مطابق 1902ء میں چھپا تھا، اس کے بعد متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔'' (اردو میں تفسیری ادب، ص:115)

عدمِ مقبولیت کے اعتراض کے ناقابلِ توجہ ہونے کے لیے ڈاکٹر نواز دیوبندی کی یہ وضاحت بھی ملاحظہ ہو:

''یہ ترجمہ نہایت سلیس اور صاف اردو میں ہے اور اہلِ علم میں مقبول ہے۔ اس ترجمے کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس کا ایک ایک حرف حضرت شیخ الہندؒ کی نظر سے گزرا ہے (سوانح علماے دیوبند:1/78)

(5) آخری بات یہ کہ 'تعجب یہ ہے کہ آپ نے اور کوئی قابلِ ذکر علمی تصنیف یادگار نہ چھوڑی جس سے آپ کی علمی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ ہوتا' یہ بھی پروفیسر صاحب کی جلد بازی یا عدمِ تتبع کا نتیجہ ہے، اس لیے ہمیں خود ان کے اس تعجب پر تعجب ہے، کیوں کہ آج سے تقریباً سوا سو سال قبل جب کہ کاغذ اور طباعت و اشاعت کی ایسی سہولیات میسر نہیں تھیں، مولانا میرٹھی سے ایک درجن سے زائد قلمی و علمی یادگار ہیں، جن کا مختصر تذکرہ اوپر ہم کر آئے ہیں، من جملہ ان کے حدیث کی ایک ضخیم کتاب 'جمع الفوائد' جس میں دس ہزار سے زائد حدیثیں ہیں، مولانا نے اس کا مکمل اردو ترجمہ کیا اور تشریحی نوٹ بھی قلم بند فرمائے ہیں، جس کے متعلق ڈاکٹر خالد محمود کا کہنا ہے کہ 'دررِ فرائد اُردو ترجمہ جمع الفوائد، مولانا عاشق الٰہی نے یہ ترجمہ کیا ہے۔ جمع الفوائد جیسی عظیم کتاب کو اُردو میں لے آنا ایک بڑا کام ہے۔' (آثار الحدیث:1/210)

مختصر یہ کہ مولانا میرٹھی اردو زبان کے سب سے کم عمر مترجمِ قرآن ہیں، انھوں نے فقط انیس سال کی عمر میں قرآن مجید کا مکمل ترجمہ مع فوائد و مختصر تفسیر پیش کیا، علاوہ ازیں حدیث کی ایک ضخیم کتاب، جمع الفوائد، کو اردو میں منتقل کیا اور درجنوں اہم دینی کتابوں کی تصنیف و ترجمے کے ذریعے اہلِ علم وعوام سے دادِ تحسین حاصل کی۔ ان کا اصل میدان یقیناً دین و مذہب ہے، اس کے باوجود ان کی متذکرہ خدمات سے یقیناً زبان و ادب میں قابلِ ذکر اضافہ ہوا ہے۔

☆☆☆

❑ شخصیات

امین الامت حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ

تحریر: عبدالمنعم الہاشمی ترجمہ: محمد عالم ندوی

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قریش میں تین شخص بڑے باحیا، بڑے خوبصورت اور بااخلاق ہیں، اگر وہ آپ سے کچھ بیان کریں تو جھوٹ نہ بولیں اور اگر آپ ان کے حوالہ سے کوئی بات کریں تو لوگ تمہاری تصدیق کریں، اور وہ تین لوگ یہ ہیں: ابوبکر، عثمان بن عفان، ابوعبیدہ بن الجراح۔

حضرت ابوعبیدہؓ اللہ کے رسولؐ کے دارِارقم میں داخل ہونے سے پہلے اسلام لائے، دس سابقون الاولون میں آپ کا شمار ہوتا ہے، قریش کی تکلیفوں اور مصیبتوں سے نجات پانے کے لئے حبشہ کی ہجرت کی، اور پھر مدینہ کی ہجرت کی، آپ ﷺ نے سعد بن معاذ اور ایک روایت میں ہے سالم مولی ابی حذیفہ کے ساتھ آپ کا بھائی چارہ کرایا تھا۔

حضرت ابوعبیدہ کا چہرہ خوبصورت تھا، جسم پتلا، مگر لمبا، اور بازو ہلکے تھے، دیکھنے میں جچتے، دل آپ کی شخصیت سے مانوس ہوجاتا، متواضع و باحیا تھے، اور امانت داری کی گواہی تو خود رسول اللہ نے دی، ایک موقعہ سے آپ نے فرمایا، ہر امت میں ایک امین ہوتا ہے اور میری امت کے امین ابوعبیدہؓ ہیں۔

جنگ بدر: جنگ بدر کے دن حضرت ابوعبیدہ کو ایک سخت امتحان سے گزرنا پڑا، ایک بڑی آزمائش کا سامنا کرنا پڑا، ابوعبیدہ دیوانہ وار کفار پر حملہ کررہے تھے، جدھر رخ کرتے میدان صاف کر دیتے، کفار حملہ کی تاب نہ لاکر ادھر ادھر ہو بھاگتے لیکن ایک شخص تھا جو بار بار ابوعبیدہ کے سامنے آرہا تھا، ابوعبیدہ اعراض کرتے لیکن ہر مرتبہ وہ شخص ابوعبیدہ کی تلوار کی زد میں آجاتا ہے، بالآخر ابوعبیدہ نے ایک وار کیا اور وہ شخص زمین پر ڈھیر تھا، قارئین آپ جانتے ہیں وہ شخص کون تھا وہ حضرت ابوعبیدہ کے والد تھے، ابوعبیدہ نے اپنے والد کا قتل نہیں کیا بلکہ اس شرک کے علمبردار کا قتل کیا تھا جو ابوعبیدہ کے والد کی شکل میں آیا تھا۔

آپ کی اور آپ کے والد کی شان میں قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی لا تجد قوما یومنون باللہ والیوم الآخر ..... الا ان حزب اللہ ھم المفلحون (المجادلۃ:۲۲)

جنگ احد: حضرت ابوعبیدہؓ جنگ احد میں شریک رہے، اور اس وقت بھی اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ میدان میں جمے ہوئے تھے جب مسلمان شکست کھارہے تھے۔

حضرت ابوبکر کا کہنا ہے کہ احد میں کفار آپ ﷺ پر حملہ آور ہوئے یہاں تک کہ آنحضورؐ منہ کے بل ایک خندق میں گر پڑے، خود کے دو حلقے آپ ﷺ کے چہرہ انور میں پیوست ہوگئے، میں تیزی سے دوڑتا ہوا آپ کے پاس پہونچا تو کیا دیکھتا ہوں ایک شخص بہت دور سے آپ کی جانب دوڑا چلا آرہا ہے، میں خدا سے اس آنے والے کے بارے میں خیر کا سوال کرنے لگا جب وہ شخص آپ کے قریب ہوا تو پتہ چلا کہ ابوعبیدہ ہیں، ابوعبیدہ نے مجھے قسم دی کہ ابوبکر تم کو خدا کا واسطہ کہ یہ خدمت آپ میرے لئے چھوڑ دیں، میں ان حلقوں کو نکالوں گا، ابوبکر پیچھے ہٹ گئے ابوعبیدہ نے اپنے آگے کے دونوں دانتوں سے خود کو کھینچا ایک کڑا نکل گیا، لیکن اس کے ساتھ ایک دانت

بھی ٹوٹ گیا، اسی طرح دوسرا کڑا نکالا جس سے دوسرا دانت بھی گر گیا، اور ابوعبیدہ بے دانت والے ہو گئے، اللہ کے رسولؐ نے جنگ احد کے بعد ایک چھوٹی سی مہم سر کرنے کے لئے ابوعبیدہ کو چالیس مجاہدین لے کر بھیجا اور یہ مہم ''ذی القصہ'' کے نام سے مشہور ہے، ابوعبیدہ نے مشرکین پر چڑھائی کی اور ان کو پہاڑوں کے راستہ سے بھاگنے پر مجبور کر دیا، ایک کو گرفتار کیا جو بعد میں مسلمان ہو گیا تھا۔

ذات السلاسل: غزوہ ذات السلاسل حضرت عمرو بن العاص کی قیادت میں قبیلہ قضاعہ سے لڑا جا رہا تھا وہاں کمک کی ضرورت محسوس ہوئی، اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت ابوعبیدہؓ کو ان کی مدد کے لئے بھیجا، اجلۂ صحابہ ابوبکر و عمر بھی ان کی زیر قیادت تھے، یہ عمرو بن العاص کے پاس پہنچے، تو عمرو نے عرض کیا میں امیر ہوں اور آپ مامور بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

ابوعبیدہ، میں اپنے لوگوں کا امیر ہوں اور آپ اپنی فوج کے، عمرو، نہیں آپ کو میری اطاعت کرنی چاہیے، اس لئے کہ آپ میری مدد کے لئے آئے ہیں۔

ابوعبیدہؓ: اللہ کے رسول ﷺ نے مجھے یہ وصیت کی تھی کہ اختلاف مت کرنا، میں آپ کی اطاعت کرتا ہوں، چاہے آپ میری نافرمانی کریں۔

ایک دوسرے موقع سے آپ ﷺ نے ابوعبیدہ کو قبیلہ جہینہ کے لوگوں سے جنگ کے لئے بھیجا یہ قبیلہ ساحل سمندر پر تھا۔ راستہ میں زاد سفر ختم ہو گیا، لشکر اسلام کو مصیبتوں کا سامنا تھا، یہاں تک کہ لوگ درختوں کے پتے کھانے پر مجبور ہوئے، قیس بن سعد نے کچھ اونٹ خرید کر لشکر اسلام کے ذبح کے لئے بالآخر غیب سے انتظام ہوا، اللہ رب العزت نے سمندر میں ایک ایسی بڑی مچھلی کو بھیجا، جو بہت دنوں تک لشکر کی غذا بنی لیکن اس جنگ میں مقابلہ نہیں ہوا، اور یہ لشکر واپس لوٹ آیا۔

فتح مکہ: فتح مکہ کے دن آپ اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ موجود تھے، بلکہ مہاجرین کے اس مبارک قافلہ میں سب سے آگے تھے جو اللہ کے رسول ﷺ کے ارد گرد موجود تھا، اور تمام مناظر کو دیکھ رہے تھے، آپ کو اللہ کے رسول ﷺ کا پورا اعتماد حاصل تھا، یہی وجہ تھی کہ قبیلہ نجران سے مخاطب ہوتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ایک ایسے شخص کو بھیجوں گا، جو نہایت امانت دار شخص ہے، ہر امت کا ایک امین ہے، اور اس امت کے امین ابوعبیدہ بن الجراح ہیں۔

سر زمین شام اور میدان یرموک کا جانباز مجاہد: حضرت ابوبکر صدیق نے ابوعبیدہ کو حمص کا امیر بنایا اور فرمایا کہ جب جنگ یرموک کے لئے تمام مسلم افواج جمع ہو جائیں جو مختلف محاذوں پر برسرِ پیکار ہیں، اس وقت سب کے امیر ابوعبیدہ ہوں گے۔

حضرت ابوعبیدہؓ نے شام کا رخ کیا اور اس راستہ کا انتخاب کیا جس سے قریش مکہ تجارت کے لئے شام جایا کرتے تھے، یہ راستہ ساحل سمندر سے ملا ہوا تھا، لشکر ۷۵۰۰ مجاہدین پر مشتمل تھا ابھی ساری فوجیں شام نہیں پہنچیں تھیں کہ ہرقل نے یہ کوشش کی کہ مسلمانوں کے لشکر ایک جگہ جمع نہ ہونے پائیں اور تمام اسلامی فوج کو الگ الگ محاذوں پر جنگ میں مشغول رکھا جائے، تاکہ ان کی طاقت ایک جگہ جمع نہ ہو سکے لیکن مسلم قائدین نے اپنی جنگی حکمت عملی اور دانائی سے میدان یرموک پر جمع ہو کر رومیوں اور ہرقل کی امیدوں پر پانی پھیر دیا، حضرت ابوعبیدہؓ نے میدان یرموک پہنچ کر رومیوں کی تعداد کو دیکھتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ سے مدد مانگی، آپؓ نے حضرت خالد کو جو کہ عراق کی مہم میں مصروف تھے، یرموک کا رخ کرنے کا حکم دیا، جیسے ہی حضرت خالدؓ یرموک پہنچے مسلمانوں کے حوصلے مزید بلند ہو گئے، لہذا حضرت خالد جنگ یرموک کے عام جنرل تھے، اور ابوعبیدہؓ فوج کے قلب میں قیادت کر رہے تھے، فوج کا یہ حصہ بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے، حضرت خالد نے رومی فوج کے قلب پر ہی پہلا حملہ کیا، حملہ ایسا سخت تھا، کہ رومی فوج کے گھوڑ سوار

اور پاپیادہ فوج تتر بتر ہوگئی، گھوڑ سواروں نے جیسے ہی بھاگنے کا راستہ پایا وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے، اور پیادہ فوج کا مسلمانوں نے خاتمہ کردیا، جنگ کا اختتام مسلمانوں کی فتح کے ساتھ ہوا۔

جنگ یرموک کے بعد شام میں اسلامی لشکر کے عام امیر ابوعبیدہؓ تھے، انھوں نے یرموک میں شرحبیل بن حسنہ کو اپنا خلیفہ بنایا اور خود برج الصفر جو کہ دمشق و جولان کے درمیان ایک جگہ ہے وہاں کا رخ کیا اور خبر یہ بھی آرہی تھی کہ شکست خوردہ رومی مقام فحل پر اپنی طاقت جمع کر رہے ہیں، مزید یہ کہ حمص سے دمشق میں رومیوں کے لئے مدد پہنچ چکی ہے، ابوعبیدہؓ نے پوری تفصیل حضرت عمرؓ کو لکھی اور مشورہ طلب کیا، عمرؓ نے لکھا کہ جنگ کی شروعات دمشق سے کی جائے اس لئے کہ یہ شام کا پایہ تخت ہے اور فحل میں بھی فوج کا کچھ حصہ رہے تاکہ فحل والے دمشق والوں سے نہ مل سکیں، ابوعبیدہؓ اس وقت روم کے ایک علاقہ مقام مرج میں تھے، یہاں سے دمشق کا رخ کیا، مقدمۃ الجیش میں خالد بن ولید، اور میمنہ ومیسرہ میں عمرو بن العاص اور ابوعبیدہ تھے جبکہ شہسواروں کی قیادت عیاض بن غنم اور پیادہ فوج کی رہبری شرحبیل بن حسنہ کررہے تھے، یہ پورا اسلامی لشکر دمشق آیا اور قلعہ کا محاصرہ کیا، محاصرہ تقریباً ۷۰ دن تک رہا، جس میں دونوں جانب سے تیروں اور توپوں کے ذریعہ ایک دوسرے پر حملہ بھی کیا جاتا رہا، لیکن اہل دمشق کے حوصلے ابھی پست نہیں ہوئے تھے کیوں کہ ان کو امید تھی کہ ہرقل کی جانب سے کچھ مدد آئے گی لیکن ایسا نہ ہوسکا تو پھر وہ لوگ ہمت ہار گئے، اور مسلمان فتح حاصل کرنے کے لئے باامید ہوگئے، ایک روز اہل دمشق پادری کے بیٹے کی ولادت کی خوشی میں پارٹی منانے میں مصروف تھے، حضرت خالد نے موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے قلعہ کے اندر داخل ہوکر دروازہ کھول دیا اور مسلمان فوج اندر داخل ہوئی، اہل دمشق نے جب فوج کو قلعہ کے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو صلح کا جھنڈا بلند کردیا، حضرت ابوعبیدہؓ نے صلح کو قبول کرلیا، اس طرح دمشق فتح ہوگیا۔

فتح شام: حضرت ابوعبیدہؓ نے دمشق کو فتح کرنے کے بعد فحل کا رخ کیا اور وہاں رومیوں کو شکست دی فحل کے بعد ابوعبیدہ اور خالدؓ نے حمص کا رخ کیا حمص کو ایک لمبے حصار کے بعد فتح کیا۔ یہاں سے حماۃ پہنچے وہاں کے لوگ مسلمانوں کی فتوحات کی خبر سن کر سہمے ہوئے تھے ان لوگوں نے جزیہ پر صلح کی یہاں سے معرۃ النعمان پہنچے یہ لوگ بھی جزیہ پر آمادہ ہوگئے، یہاں سے مقام لاذقیہ کا رخ کیا لاذقیہ کا ایک صدر دروازہ تھا، جس کی مضبوطی کا یہ عالم تھا کہ اس کو کھولنے کے لئے لوگوں کی ایک بڑی جماعت درکار ہوتی تھی، مسلمانوں نے اس سے تھوڑی دور پڑاؤ ڈالا، اور یہ تدبیر اختیار کی کہ وہاں پر ایسے گڑھے کھودے جس میں ایک سوار آسانی سے چھپ سکتا ہو، صبح ہونے پر دشمن کے سامنے ایسا ظاہر کیا جیسے کہ مسلمان فوج واپس جارہی ہو، جب رات ہوگئی تو اسلامی فوج کے شہسوار ان گھڑے میں چھپ گئے، پھر صبح ہوتی ہے اور اہل لاذقیہ یہ خیال کرتے ہیں کہ مسلمان واپس جاچکے ہیں وہ اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے، مسلمان موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے شہر میں داخل ہوگئے اور لمحوں میں شہر لاذقیہ فتح ہوگیا، اس کے بعد حمص اور اس کے اردگرد کے شہر فتح ہوئے، یہاں تک کہ پورا ملک شام فتح ہوگیا، پورے شام سے مراد موجودہ شام، فلسطین، لبنان، اور اردن سب فتح ہوگئے، حضرت ابوعبیدہؓ اردن میں تھے کہ طاعون کی خطرناک بیماری پھیل گئی، اور سینکڑوں لوگ اس کے شکار ہوگئے، حضرت عمرؓ نے یہ کوشش کی کہ حضرت ابوعبیدہؓ وہاں سے نکل آئیں، لیکن انھوں نے یہ گوارا نا کیا کہ اپنے لشکر کو چھوڑ کر وہاں سے کہیں اور جائیں، بالآخر ابوعبیدہؓ بھی طاعون کا شکار ہوگئے، اور اٹھارہ ہجری ۶۳۹ کو اس دار فانی کو رخصت کہا، اس وقت مسلمانوں کے خلیفہ حضرت عمرؓ تھے، آپ کی عمر ۵۸ سال تھی آپ کی قبر مبارک بیت المقدس سے چار میل کی دوری پر مقام ممداس میں ہے۔

☆☆☆

❑ شخصیات

تاریخ تیری قربانیوں پہ رقصاں ہے!

شہباز نعمانی سنبھلی

چوبیس پچیس سال کا ایک خوبرو سجیلا اور رعنا نوجوان، جو کسی نازنین حسینہ کی طرح اپنے وقت کا بیشتر حصہ اپنے سجنے سنورنے اور زلفوں کے بناؤ سنگار میں صرف کرتا، جس کے لباس پر لگے عطر کی خوشبو دور دور تک پھیل کر گلی کوچوں سے اس کے گزرنے کا پتہ دیتی، ایک دن اپنے شاہانہ کمرے میں، بستر پر بیٹھا تصور وتخیلات کی دنیا میں گم تھا، اس کی پیشانی پر ابھرنے والی شکنیں اس کی بے چینی و بے قراری کی کیفیت کو بہت صاف انداز میں واضح کر رہی تھیں، اس کی فطرتِ سلیمہ نے جو ناز ونعم میں پروان چڑھنے کے باوجود فساد و بگاڑ کا شکار نہیں ہوئی تھی، اس سے زندگی اور تخلیق انسانی کے بارے میں ایسے پیچیدہ سوالات کر ڈالے تھے؟ کہ جنکا جواب عقل وشعور کا سرمایہ رکھتے ہوئے بھی دینے سے وہ عاجز وقاصر تھا، وہ انتہائی تفکر و تدبر اور بے خودی کے عالم میں بیٹھا تھا، اس کا ضمیر سوالی بن کر اس کے ذہن کے دریچوں پہ دستک دے رہا تھا، یہ خوشحالی و آسودگی، خوش پوشی و جامہ زیبی، یہ دلکشی و رعنائی، یہ ناز ونعمت اور یہ زیب و زینت، یہ عمدہ خوشبویات اور اعلی ملبوسات، یہ حسن و جمال اور یہ زلفوں کی تراش وخراش، یہ ٹیپ ٹاپ اور یہ بناوٹ وسجاوٹ، یہ چاہتوں کی دنیا اور مہ جبینانِ عرب کا مرکزِ توجہ بننا! کیا یہی سب کچھ زندگی کی اعلی قدریں ہیں؟؟

کیا انسان کی تخلیق کا مقصد یہی کچھ ہے؟ کہ وہ نفس اور شیطان کا غلام بنا رہے، اور اپنی خواہشات کی پرستش اور ان کی تکمیل میں رات ودن تگ ودو کرتا رہے؟ اور بھیڑ بکریوں کی طرح گزر بسر کر کے زندگی کے راز سے ناآشنا رہے، راہ حیات پر چلتے ہوئے بھی اپنے من میں ڈوب کر زندگی کا اصل اور حقیقی سراغ پانے سے محروم ہی رہے، اس قسم کے چند سوالات تھے جو اس کے اندر کلبلا رہے تھے، اور اس کو بے چین و بے قرار کئے ہوئے تھے، بالآخر ایک صبح اس نوجوان کو ان ڈھیر سارے سوالات کے جوابات مل گئے، فطرت میں سلامتی تھی، بس پردہ اٹھنے کی دیر تھی، پردہ اٹھا تو حق کی کرنوں نے دل کے ساتوں طبق روشن ومنور کر دئے، ذکاوت وذہانت کی کمی نہ تھی، ایمان ویقین کی روشنی جذب ہو کر رہ گئی، یہ ان دنوں کی بات ہے، جب علمبردارانِ حق کو مکہ کی کھلی فضا میں سانس لینا بھی دشوار اور دوبھر تھا، زہرہ گداز اذیتوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، ظلم و جور کے ہتھکنڈے کام میں لائے جا رہے تھے، اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے فدائین اور جانثاروں کے ہمراہ دارارقم میں پناہ گزیں تھے، اسی پرفتن و پرآشوب دور میں یہ خوبرو وخوش پوشاک نوجوان کفر وشرک کے سمندری تھپیڑوں سے نکل کر رحمت و ہدایت کے دریائے ناپیدا کنار تک جا پہنچتا ہے، رسالت مآب کی خدمت میں حاضر ہو کر اور بادہ ایمان سے سرشار ہو کر اپنے والہانہ سجدہ کی تپش سے 25 سالوں کے بنے بنائے بت پرستی کے خرمن کو آن واحد میں

خاکستر کر کے رکھ دیتا ہے، یہ اس کی پہلی ہجرت تھی جس میں اس نے کفر وشرک کے محلوں کو ڈھا کر اسلام کے آہنی قلعہ میں پناہ لی تھی، اور لات وہبل کی پرستش کو چھوڑ کر ایک اللہ کی بندگی قبول کر لی تھی، اور رسول خدا کے لائے دین پر لبیک کہہ کر اپنے آبائی مشرکانہ دین کو الوداع کہہ دیا تھا، وہ آتو گیا تھا، مگر خاندانی مذہب سے بغاوت کی پاداش میں خوب زدوکوب کیا گیا، عزیزوں نے آنکھیں دکھائیں، ماں کی والہانہ چاہتوں نے نفرت کی جھلستی آگ میں ڈالا، محبت سے لبریز جذبات نے ہاتھ کھینچ لئے، سر سے دست شفقت اٹھالیا گیا، ماں کی مامتا بھری آنکھوں سے نفرت وعداوت چھلکنے لگی، اور ہزار ہتھکنڈے اپنائے گئے رخ پھیر کر آبائی دین میں واپس آنے کے، لیکن وہ آخری فیصلہ کر چکا تھا، وہ راہ حق میں مر مٹنے اور قربان ہوکر ہمیشہ ہمیش کے لئے تابندہ ستارہ اور آنے والی نسل کے لئے مشعل راہ بننے کا عزم مصمم کر چکا تھا، طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں، قید میں ڈالا گیا لیکن اس کے پائے ثبات میں تزلزل اور اضمحلال نہیں آیا، وہ پورے حوصلے کے ساتھ حق پر ڈٹا اور جما رہا، جو جسم ناز ونعم میں پلا بڑھا تھا اب وہ خزاں رسیدہ پتیوں کی طرح سوکھ کر پیلا پڑ چکا تھا، لیکن حیات تازہ کے رنگ ونکہت سے سرشار تھا، جس چہرے کی شادابی ودلکشی دیکھنے والوں کی آنکھوں کو اپنی طرف مسحور کر لیتی، اب وہ ستا ستا سا نظر آنے لگا تھا، کیونکہ اب عیش وعشرت کے آشیانے پر زہد وفقر کا بسیرا ہو چلا تھا، عیش وتنعم سے گریزاں، اقلیم زہد واستغناء کے اس بادشاہ نے ایک موقع پر دربار نبوت میں اس حال میں حاضری دی کہ ستر پوشی کے لئے معمولی سا کپڑا بھی میسر نہیں تھا، جسم ایک کھال سے لپیٹ رکھا تھا، جس میں جابجا پیوند لگے ہوئے تھے، نگاہ نبوت نے جب اس حال میں دیکھا تو بے قرار ہوکر تڑپ اٹھے، اور آبشار کے مانند آنسوؤں کا ایک سیلاب بہہ پڑا، اور اس کو اس لاچارگی کے عالم میں دیکھ کر غمزدہ حالت میں فرمایا، دنیا والوں کی حالت تبدیل ہونی چاہیے، میں نے مکہ میں اس سے بڑھ کر ماں باپ کا لاڈلا، نعمت وآسائش کا پروردہ، کسی کو نہیں دیکھا، پھر آج دیکھتا ہوں تو اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں سارے عیش وآرام راحت وسکون قربان کر چکا ہے۔ مبارک اے نوجوان، کہ دنیا کی سب سے عظیم ہستی کی مقدس زبان تیری ستائش پہ رطب اللسان ہوئی، وہ جس کی پاکیزہ زبان سے وحی ربانی کے موتی بکھرتے تھے! خوشا نصیبی جو اس سے تیرے زہد وفقر کو تبریک وتہنیت کے نذرانے ملے! خدا کے نام پر تیرے دکھ کو سراہا گیا! تیری عظیم قربانی کی داد دی گئی! تیرے صبر وشکیب پہ فخر وناز کے گوہر لٹائے گئے! تیرے انقلابی فیصلے، تیری جرأت اقدام، تیرے جذبہ ایثار اور جور وجفا پہ تیری قوت برداشت کی تائید ہوئی! تیری یہ مقدس زندگی آج ہمارے لئے تازیانہ عبرت ہے! اور جب تک انسانیت زندہ رہے گی تیری عبرتیں، تیری حکمتیں، تیری بے لوث چاہتیں اور تیری بے پناہ قربانیاں زندگی کے لئے نشان راہ منزل بنی رہیں گی، تین ہجری میں پیش آنے والے غزوہ کی علمبرداری کا تاج زریں اسی نوجوان کے سر رکھا گیا، ایک ہاتھ میں تلوار دوسرے میں علم لئے ہوئے میدان کارزار میں اپنی جواں مردی کے جوہر دکھاتا اور صفوں کو چیرتا ہوا نکل جاتا، یکا یک ایک دشمن نے آکر اتنی تیزی سے حملہ کیا کہ داہنا ہاتھ کاٹ گیا، تو علم دوسرے ہاتھ میں لے لیا، وہ بھی بدن سے الگ کر دیا گیا تو پھر علم کو سینہ سے چمٹا لیا، لیکن محبوب کے سونپے ہوئے توحید کے علم کو سرنگوں ہونے نہ دیا، لیکن خود فرش خاک پر جا گرا، آخر کار دشمن نے اس زور سے نیزہ مارا کہ وہ سیدھے سینہ مبارک میں جا کر پیوست ہوگیا، اور طائر روح قفس عنصری سے تیزی کے ساتھ اپنی اصل منزل کی طرف پرواز کر گیا، اور اسلام کا یہ جانباز اور نڈر سپاہی، حیات فانی سے حیات جاودانی کی طرف اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے کلمہ شہادت کا ورد کرتا ہوا دنیا کو اس حال میں

خیرآباد کہہ گیا، کہ اس کی نعش کو کفن دینے کے لئے بھی پورا کپڑا نہیں تھا، پاؤں کو ڈھکا جاتا تو پیر مبارک کھل جاتے، پیر ڈکھے جاتے تو چہرہ بے نقاب ہوجاتا، اس منظر کو دیکھ کر شاید فرشتے بھی رو دیئے ہوں،، عالم بالا میں ایک شور بپا ہوا ہو، کہ جو ہمیشہ عمدہ اور نفیس قسم کا قیمتی لباس زیب تن کیے رہتا، آج اس کے جسد مبارک کو ڈھانپنے کے لئے پورا کپڑا بھی میسر نہیں، لیکن اس کی اس قربانی نے اسے ہمیشہ ہمیش کے لئے تاریخ کے دامن میں جگہ دے دی، اور امت مسلمہ کے ڈھرکتے دلوں میں زندہ جاوید بنا دیا،

اے نوجوان! تیری پاکیزہ روح کو سلام!

سلام تیرے جذبہ اور غیرت ایمانی کو!

سلام اللہ ورسول سے تیرے عشق ومحبت، الفت ومودت کو!

تو رہروان شوق کا سرخیل ہے!

تو فدویت اور جاں سپاری کا امین ہے!

میانہ قد و قامت، پر رونق چہرہ، روشن جبیں، شیریں گفتار، جادو بیان، شگفتہ مزاج، ملنسار وخلیق، خوش پوشاک و شائستہ اطوار، پسندیدہ خو، سلیم الطبع، دانا و بینا، فہیم وطباع، جوہر شناس و رمز آشنا نوجوان کو، اور ہادی اعظم کے اس مبلغ اول کو، اس مومن مجاہد اور خطیب ہوش مند کو، اس سحر انگیز اور دلآویز شخصیت کو دنیائے اسلام حضرت مصعب بن عمیر کے نام سے جانتی ہے. رضی اللہ عنہ۔

☆☆☆

(**صفحہ ۴۶ کا بقیہ**.....) بالآخر ۱۹۸۰ء میں بیت المقدس کو حکومت اسرائیل کا دارالسلطنت قرار دیا جاتا ہے، ایک رپورٹ کے مطابق اس وقت فلسطین میں یہودی ۸۰%، فلسطینی ۱۸% اور مسیحی ۲% آباد ہیں، ایک زمانہ تھا جب بیت المقدس میں فلسطینیوں کی تعداد ۹۰% سے زیادہ تھی۔

مختصر یہ کہ عہد فاروقی سے لے کر آج تک کی اس طویل ترین مدت میں صلیبی قبضہ کے ۸۸ سال اور یہودی قبضہ کے ۶۵ سال نکال دیئے جائیں تو بقیہ پوری مدت بیت المقدس پر مسلمانوں ہی کی حکمرانی رہی، اس اعتبار سے بھی خطہ پر جتنا حق مسلمانوں کا ہے اور کسی کا نہیں، البتہ یہودیوں کا یہ ناجائز قبضہ رسول برحق کی جانب سے امت کے لئے وعدہ وبشارت ہے، اور ایک دن مسلمانوں کا غلبہ حتمی ویقینی ہے، جس سے خود یہودیوں کو بھی انکار نہیں ہے۔

جب اسرائیل کی سابق وزیر اعظم ''گولڈا میئر'' سے پوچھا گیا کہ کیا مسلمان یہودیوں پر پھر غالب آسکتے ہیں؟ تو اس نے جو جواب دیا اس سے مسلمانوں کو عبرت لینی چاہئے، اس نے کہا: کہ ہاں، لیکن اس وقت جب مسلمانوں کی تعداد فجر کی نماز میں بھی اتنی ہی ہونے لگے جتنی اس وقت جمعہ میں ہوتی ہے۔

اس وقت یہ سرزمین پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ: کاش! کوئی عمر فاروق ظاہر ہوتا اور ہمیں اس اسیری سے نجات دلاتا، کاش! کوئی صلاح الدین ایوبی آتا اور ہمیں اس قید ظلم وجور سے آزاد کردیتا، یا کاش! کم سے کم آج کے مسلم حکمرانوں میں کوئی سلطان عبدالحمید ہوتا جو مادی نقصان اور اقتدار سے محرومی تو گوارا کرلیتا، لیکن دینی حمیت اور ملی غیرت کا سودا نہ کرتا!!!

اس سلسلہ میں پوری دنیا میں بسنے والے ہر مسلمان پر واجب وضروری ہے کہ اس مسئلہ کو ایک دینی واسلامی مسئلہ سمجھ کر کم از کم درج ذیل امور پر عمل کرنے کی کوشش کرے:

۱) اس مسئلہ کی حقیقت کو خود بھی سمجھیں، اور دوسروں کو بھی سمجھانے کی کوشش کریں۔

۲) اس سلسلہ میں نا امیدی کی جو فضا پھیل رہی ہے، اس کو ختم کرکے امید کی کرنوں روشن کریں۔

۳) اس مسئلہ کے جو بھی خلاف ہو، اس کا ہمہ جہتی بائیکاٹ کیا جائے۔

۴) اللہ سے خوب خوب دعا کی جائے۔

۵) خود اپنی اور اپنے معاشرہ کی اصلاح کی جائے۔

یہ پانچ مختصر نکات ہیں، اللہ کی ذات سے امید ہے کہ اگر کوئی مسلمان کم از کم ان نکات پر مکمل طور پر عمل کرے گا، تو روزِ قیامت وہ اس سلسلہ میں گرفت سے محفوظ رہے گا، اور ان شاء اللہ جلد از جلد وہ دن بھی آئے گا جب قبلۂ اول مسلمانوں کی تحویل میں ہوگا۔

☆☆☆☆

□ تعارف کتب

تفسیر ماجدی- گوناگوں خصوصیات کی حامل تفسیر

نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی

قرآن کریم قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لئے زندگی گزارنے کا کامل ومکمل ہدایت نامہ ہے۔اس کی ہدایات وتعلیمات کے مطابق جو زندگی گزاری جائے وہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہوگی اور جو اس کے متضاد ومخالف ہوگی وہ رب کائنات کو ناپسند ہوگی۔

خدائے رحمٰن ورحیم کی یہ آخری کتاب رحمۃ للعالمین خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر فرشتہ خداوندی حضرت جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے ۲۳ برس کی مدت میں نازل ہوئی۔ یہ اسلامی شریعت کا اولین اور بنیادی ماخذ ہے،اس لیے اسلام کے صدر اول ہی میں اس کے احکام ومعانی، دقائق وغوامض میں وغور وتفحص اور ان کی شرح وتفسیر کرنے کا کام شروع ہوگیا تھا۔ رسول اکرمؐ کے سچے اور اچھے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو دین اسلام کے اولین داعی ومبلغ تھے اس کتاب ہدایت کے بہترین شارح و ترجمان تھے۔ان نفوس قدسیہ نے اپنے محبوب رسول اکرمؐ سے الکتاب کی تعلیمات وہدایات علمی وعملی دونوں طرح سے حاصل کرکے بندگان خدا کو ان سے روشناس کرایا۔ترجمانی وتفسیر کلام الٰہی کا مقدس کام عہد بہ عہد ہوتا رہا۔صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی مقدس جماعت میں سے حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی مرتضیٰ، حضرت عبداللہ ابن عباس، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابی بن کعب، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہم تفسیر قرآن کے سلسلے میں مشہور ہوئے۔ (ملاحظہ ہو''التفسیر والمفسرون'' جلد اول،ص:۶۴، از ڈاکٹر محمد حسین الذہبی مطبوعہ مصر،سن طبع ۱۴۰۵ھ)

سب سے زیادہ تفسیری اقوال رئیس المفسرین ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہیں۔

خوش قسمت ہیں وہ اہل علم جن کو بہ توفیق الٰہی الکتاب کی ترجمانی، تشریح اور تفسیر کی سعادت حاصل ہوئی۔ان با توفیق بندگان رب العالمین میں مایہ ناز مفسر قرآن اور ممتاز ادیب وصحافی مولانا عبدالماجد دریابادی (پیدائش:۱۶ مارچ ۱۸۹۲ء وفات:۶ جنوری ۱۹۷۷ء) کا اسم گرامی قابل ذکر ہے جنہوں نے انگریزی واردو دونوں زبانوں میں کلام الٰہی کی ترجمانی وتفسیر کی۔

دینی خدمات اور علمی فتوحات میں مفسر دریابادیؒ کا سب سے درخشاں اور تا قیام قیامت باقی رہنے والا کارنامہ تفسیر ماجدی (انگریزی اور اردو) ہے۔ دونوں زبانوں میں کلام الٰہی کی ترجمانی وتشریح پر مبنی یہ تفسیریں اس مایہ ناز مفسر کے اخلاص، حسن

نیت، صحیح قرآن فہمی، تدبر فی الآیات، تمسک بالسنہ، جمہور کے عقائد ومسلک کی مستند ترجمانی، اسلام سے والہانہ شیفتگی، رحمٰن دنیا اور رحیم آخرت کی حقانیت پر بھرپور یقین، رحمۃ للعالمین خاتم الانبیاء سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ فداہ ابی وامی کی صداقت پر کامل اعتماد، مطالعے کی وسعت، فکر کی رسائی، نقد ونظر کی گیرائی، مشاہدے کی گہرائی، اسلوب کی رعنائی، زبان وبیان کی دل کشی منطقی طرز استدلال، حکیمانہ بصیرت اور خطیبانہ حرارت کا روشن نمونہ ہیں۔

مفسر دریابادی کے ترجمے اور تفسیر کی چند نمایاں ترین خصوصیات یہ ہیں:

☆ ترجمہ زبان اور انداز بیان کے لحاظ سے نہایت عمدہ۔

☆ تفسیر میں جمہور کے عقائد کی ترجمانی۔

☆ آیتوں کی ترجمانی وتفسیر میں غیر معذرت خواہانہ انداز۔

☆ اصل مصادر اور بنیادی مآخذ سے براہ راست استفادہ۔

☆ اردو اور انگریزی زبان وادب پر حاکمانہ عبور کے ساتھ ساتھ عربی زبان وادب سے بھی اچھی طرح واقفیت۔

☆ مذاہب عالم خصوصاً یہودیت اور مسیحیت پر عمیق نظر، ان کا تقابلی مطالعہ، ان کے اہم علمی، تحقیقی، ادبی، ثقافتی اور تہذیبی کارناموں کی بھرپور معلومات۔

☆ کلام ربانی کی ترجمانی وتشریح میں ادعائیت بالرائے سے کامل اجتناب۔

☆ ترجمے اور تفسیر کے مطلوبہ علوم کا مستند اور قابل تعریف علم۔

☆ حوالوں اور مراجع کا مکمل اہتمام۔

☆ قدیم مآخذ تک بلا واسطہ لائق ستایش رسائی اور جدید معلومات سے قابل صد رشک آگاہی۔

ایسی گونا گوں خصوصیات وامتیازات کی حامل تفسیر کے بارے میں اکابر علمائے کرام کی رائے اور تبصرے ذیل میں درج ہیں:

علامہ سید مناظر احسن گیلانیؒ نے تفسیر ماجدی کے مطالعہ کے بعد مولانا دریابادی کو یہ مکتوب تحریر فرمایا:

''تفسیر ماجدی کی دوسری قسط روح افزا اور دیدہ افروز ہوئی۔ مطالعہ میں مشغول ہوگیا، کیوں کہ کافی اہم سورتوں سے اس کا تعلق تھا..... تفسیر ماجدی میرے نزدیک تو موجودہ صدی میں قرآن کی ایسی خدمت ہے جس کی قدر وقیمت کا اندازہ اس وقت ہمارے مولویوں کو ہو یا نہ ہو لیکن زمانہ جیسے جیسے آگے کی طرف بڑھتا جائے گا، اسی قسم کی تفسیریں مسلمانوں میں جگہ حاصل کرتی جائیں گی۔ اقاصیص وروایات والی کتابوں کا زمانہ ختم ہوگیا، ہمارے علماء انہی کے عادی ہیں۔ ان کو اندازہ ہی نہیں ہے کہ قرآن کو دنیا اب کس طرح سمجھنا چاہتی ہے۔ خدا کی بات خدا ہی کی بات کی حیثیت سے سمجھ میں آئے، مطالبہ اس کا بڑھ رہا ہے، لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ روایتوں کے بغیر قرآن کے سمجھانے اور سمجھنے کی کوئی دوسری راہ ہی نہیں ہے۔ بحمد للہ آپ کا کام ہر لحاظ سے کامیاب اور عہد حاضر کے تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ سلف کی راہ سے بال برابر بھی الگ نہیں ہوا ہے۔ میرے لیے تو قدم قدم پر اس تفسیر میں نئے معلومات کا ذخیرہ ہی ملتا چلا جاتا ہے، خدا کرے آئندہ حصے بھی جلد سامنے آجائیں''۔

علامہ گیلانی کے مکتوب کے بعد مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں:

''ایک حقیر وبے بضاعت کی سعی وکاوش ہی کیا، بہرحال اگر اللہ کے کلام کی کچھ صحیح ومناسب حال ترجمانی ہوسکی ہے تو یہ شاید ایک بڑی حد تک خود مولانا اور انہی جیسے اللہ کے نیک بندوں کی

دعاؤں اور حوصلہ افزائیوں کا نتیجہ ہے۔ یہ جلد سورۃ المائدہ سے لے کر سورۃ البرأۃ کے خاتمہ تک ہے اور تیسری جلد جو سورۂ نحل کے خاتمہ تک ہے۔ (خیال رہے کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب تفسیر ماجدی تاج کمپنی لاہور سے شایع ہو رہی تھی۔) سننے میں آیا ہے کہ وہ بھی شائع ہوگئی ہے..... عام مولوی صاحبان کے جمود اور خالص تقلیدی ذہنیت پر تو کیا عرض کیا جائے، لیکن اللہ کی اس نعمت کا شکر کس زبان سے ادا کیا جائے کہ اس حقیر سے کام کو اس نے وقت کے ایک نہیں متعدد صاحب نظر و مستند علمائے دین کی نگاہ میں بلند و معتبر کر دکھایا ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور علامہ سید سلیمان مرحوم، مولانا محمد اویس نگرامی (استاذ تفسیر دارالعلوم ندوہ) تو خیر ندوی ہی ہیں اور فاضل گیلانی بھی سالہا سال انگریزی دانوں سے تعلق کی وجہ سے ندوی ہی ہو گئے ہیں۔ خوش قسمتی یہ ہے کہ مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی ثم پاکستانی اور مولانا محمد طیب صاحب دیوبندی جیسے قدیم خیال کے بزرگوں کے دلوں میں بھی ہر طرح محبت ہی ڈال دی ہے''۔ (ملاحظہ ہو: ہفتہ واری صدق جدید لکھنؤ، جلد نمبر ۵، شمارہ نمبر ۱، ۳ دسمبر ۱۹۵۴ء)

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند اس تفسیر کے متعلق اپنی گراں قدر رائے یوں ظاہر کرتے ہیں:

''تفسیر ماجدی حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی شاہ کار کتاب ہے جس میں تمام علم دوست طبقوں بالخصوص نوتعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے ان کی نفسیات کے مطابق کافی سامان فراہم کر دیا گیا ہے۔ تفسیر کی پاکیزہ زبان، بلیغ تعبیر، جامع مضامین و مطالب اور قرآنی حقائق کی سہل ممتنع انداز سے تفہیم اس تفسیر کے خاص امتیازات ہیں۔

..... مجھے تفسیروں میں دو چیزوں کی جستجو اور تلاش زیادہ رہتی تھی۔ ایک یہود و نصاریٰ سے متعلقہ آیات میں قرآن نے جن تاریخی پہلوؤں کی طرف اشارے کیے ہیں ان کی بقدر ضرورت تاریخی تفصیل کہ اس کے بغیر قرآن حکیم کا وہ مطمح نظر پورا سامنے نہیں آسکتا جو ان آیات سے متعلق ہے۔ دوسرے یہ کہ توراۃ انجیل اور قرآن حکیم کے مقاصد کا تقابلی انداز سے موازنہ کہ اس کے بغیر قرآنی مقاصد کی بالادستی اور برتری سامنے نہیں آسکتی تھی۔ اس جلیل القدر تفسیر میں کتاب کھولتے ہی پہلی نظر میں یہی دو مقصد سامنے آگئے اور عرصۂ دراز کی تشنگی ایک دم بجھتی نظر آئی۔ اس لیے میں اپنے اس ذہنی نقطۂ نظر سے انہی دو پہلوؤں کو تفسیر کے امتیازی پہلو سمجھنے پر مجبور ہو گیا۔ مولانا ممدوح نے جس کمال ایجاز بیانی سے ان تاریخی اور علمی تفصیلات کے دریا کو کوزے میں بند کر کے پیش فرمایا ہے وہ بلاشبہ انہی کا حصہ ہے۔ تفسیر کے دوسرے پہلو، بلیغ تفہیم، مطالب قرآنی کی واضح تقریرات، اس کی علمی مکنونات کو بہ آسانی منظر عام پر لا کر رکھ دینا، مسائل کے ساتھ موثر دلائل وغیرہ بلاشبہ تفسیری کمالات ہیں لیکن خود تفسیر کے مبانی کو کھول دینا جس پر تفسیر ہی معلق ہو بلاشبہ امتیازی کمال ہے''۔ (ملاحظہ ہو: تفسیر ماجدی نقد و نظر، ص: ۳۷ و ۳۸)

مولانا محمد اویس نگرامی ندویؒ سابق شیخ التفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ رقم طراز ہیں:

''مفردات قرآن کی تحقیق، نحوی مشکلات پر تنبیہ، ادبی لطائف کا ذکر، کلامی مباحث کی ضروری تشریح، تاریخی واقعات پر مستند معلومات، آیات سے مستنبط مسائل کی طرف اشارات، یہ امور اس تفسیر کی اہم خصوصیات میں سے ہیں۔ زبان کی سلاست اور روانی ان سب سے ماسوا ہے۔ پورے وثوق کے ساتھ کہا جا

سکتا ہے کہ اس دور میں جو اہم علمی خدمات انجام پائی ہیں یہ تفسیر ان میں ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے اور ان شاء اللہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ، علماء اور مدارس عربیہ کے منتہی طلبہ، سب کے لیے مفید اور بے حد کارآمد ثابت ہوگی''۔ (ملاحظہ ہو حوالۂ بالا)

مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ مدیر نامہ برہان دہلی کی رائے:

''مولانا کی تصنیفی زندگی کا آغاز ایک فلسفی اور اردو شعر و ادب کے ایک نقاد کی حیثیت سے ہوا۔ مطالعے کے دھنی اور رسیا، نظر میں وسعت اور ذہانت وفطانت خداداد، اس زمانے کے باکمال اربابِ قلم کی معیت وصحبت پھر سب سے بڑی بات یہ کہ انشا وتحریر کا ایک منفرد اسلوب، ان سب چیزوں نے مل جل کر عنفوان شباب میں ہی اردو زبان کا ایک ممتاز ادیب اور مصنف بنا دیا۔ مولانا نے تذکرہ وسوانح، شعر وادب، تاریخ وفلسفہ اور اجتماعی مسائل، ان سب پر بہت کچھ لکھا اور اچھے سے اچھا لکھا لیکن آپ کا سب سے بڑا کارنامہ، جو بقائے دوام کا ضامن ہے وہ انگریزی اور اردو میں ترجمہ وتفسیر کلام مجید ہے۔

.....تفسیر ماجدی کے بعد جن حضرات نے قرآن مجید کی تفسیر یا اس کی تفہیم کے سلسلے میں ان موضوعات پر لکھا ہے اس میں انہوں نے درحقیقت مولانا کی ہی خوشہ چینی کی ہے۔ مولانا کے خامۂ زرنگار سے جو مضمون نکل گیا سدا بہار ہوگیا، لیکن علمی، تحقیقی اور ادبی حیثیت سے تفسیر ماجدی مولانا کا وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جس کی آب وتاب وقت گزرنے کے ساتھ اور بڑھے گی اور آئندہ نسلیں شکر گزاری کے ساتھ انہیں یاد کریں گی''۔ (ملاحظہ ہو: حوالہ مذکور ص: ۴۳، ۴۴)

مولانا منظور نعمانیؒ مدیر ماہ نامہ الفرقان لکھنؤ تحریر کرتے ہیں:

''مولانا نے اتنا لکھا کہ ان کے معاصرین میں شاید ہی کسی نے اتنا لکھا ہو، لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی تفسیر قرآن ہے۔ چوں کہ مولانا کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور خاص کر یہود ونصاریٰ کی تاریخ اور توراۃ وانجیل وغیرہ صحف قدیم کی شروح اور ان سے متعلق کتابوں کے مطالعے کا انہوں نے خاص اہتمام فرمایا تھا، اس لیے ان کی تفسیر میں بہت سی ایسی چیزیں مل جاتی ہیں جو دوسری تفسیروں میں نہیں ملتیں اور قرآن پاک کے سمجھنے میں ان سے بڑی مدد اور رہ نمائی ملتی ہے''۔ (ملاحظہ ہو: حوالہ سابق، ص: ۴۵)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ رقم طراز ہیں:

''اس کارِ عظیم کو انجام دینے کے لئے مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ نے کمر ہمت باندھی اور انگریزی اور اردو میں اپنے تفسیری نوٹس کے ذریعے اس خدمت کو انجام دیا۔ اس کام کی تکمیل کے لیے ہمارے علم میں وہ موزوں ترین آدمی تھے۔ اس لیے کہ وہ جدید علوم میں بصیرت رکھتے تھے، ان کو مطالعے کا شوق نہیں بلکہ عشق تھا۔ ان کی نظر میں غیر معمولی وسعت اور ثقافت میں تنوع تھا۔ وہ جدید طبقے کی نفسیات اور ذہنی ساخت سے واقف تھے، علم کے تیز رفتار رواں دواں قافلے سے وہ کبھی پچھڑ نے نہیں پائے۔ اور اس تفسیری خدمت کے دوران میں تو انہوں نے خاص طور پر اس کا اہتمام رکھا کہ کوئی ایسی کتاب ان کی نظر ومطالعے سے بچنے نہ پائے جس سے قرآن مجید کے بیانات کی تصدیق میں کچھ بھی مدد ملتی ہو۔ سالہا سال کی اس کوشش ومطالعے، اور عرق ریزی کا نتیجہ ان کی انگریزی اور اردو کی تفسیر ہے۔

''تفسیر ماجدی'' اپنی بعض خصوصیات میں منفرد ہے اور تمام

تفسیری ذخیرے کی موجودگی میں اس کی بہرحال ضرورت تھی۔ قرآن مجید کے بیسیوں مقامات ایسے ہیں کہ ان میں قرآن کا اعجاز اور وحی محمدؐ کی صداقت پورے طور پر اس وقت تک عیاں نہیں ہو سکتی جب تک کہ ان آیات کا تاریخی پس منظر سامنے نہ ہو اور جن اقوال وعقائد کی تردید یا نفی کی گئی ہو، ان کی حقیقت واصلیت اور ان کی اس دور میں اہمیت ومقبولیت وعمومیت معلوم نہ ہو، اس سلسلے میں مولانا عبدالماجد صاحب نے ایک نہایت قابل قدر خدمت انجام دی ہے، جس کا شکریہ ان سب لوگوں پر واجب ہے جو مغربی زبانوں سے براہِ راست واقفیت نہ رکھنے کی وجہ سے ان ماخذوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے، یا ان کے پاس اتنا وقت اور ایسا وسیع کتب خانہ نہیں ہے۔ قرآنی واقعات وقصص اور مقامات وامکنہ، نیز اشخاص واقوام اور مذاہب وفرق سے متعلق انہوں نے اتنا مواد جمع کر دیا ہے جو یکجا نہیں مل سکتا، پھر جہاں تک میری نظر پڑی ہے، وہ مسلکِ سلف سے ہٹے نہیں ہیں۔

ہمارے محدود علم میں (اور یہ بات وسیع سفروں اور سیاحتوں، یورپ اور امریکہ کے سفروں اور وہاں کی بہت سی علمی کوششوں سے واقفیت کے بعد لکھی جارہی ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے ہندستان کے ایک محقق اور فاضل یگانہ اور خادم دین مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کو توفیق دی کہ وہ تقابلِ مذاہب اور تقابلِ صحف سماوی کا منظّم، وسیع اور مخلصانہ مطالعہ فرمائیں اور کم سے کم انگریزی میں شایع ہونے والی تنقیدی، احتسابی و تقابلی کتابوں، موسوعات، انسائیکلوپیڈیاز اور وقتاً فوقتاً شایع ہونے والے مضامین ومباحث کا مطالعہ جاری رکھیں اور ان کے حوالے ونشان دہی سے بدیہی حقائق کی طرح قرآن مجید کے اعجاز اور اس کی محفوظیت اور تورات وانجیل کے تحریفات، خارجی اضافات اور ذات وصفات خداوندی کے خلاف بیانات اور نسبتوں سے پردہ اٹھائیں۔ یہ ایک خادم دین مترجم ومفسر قرآن کا وہ کارنامہ اور اس کے اخلاص وبلند ہمتی کا شاہ کار ہے، جس میں راقم حروف کی نظر میں ان کا اس عہد میں نہ صرف ہندستان بلکہ کسی اسلامی ملک میں بھی کوئی ہم سر اور نظیر نظر نہیں آتا''۔ (ملاحظہ ہو: مقدمہ تفسیر ماجدی جلد اول، شایع کردہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ)

مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ تفسیر ماجدی کی خصوصیات کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:

''تفسر ماجدی کی انفرادیت کا چوتھا رخ یہ ہے کہ یہ تفسیر مفسر گر ہے۔ اگر کسی ایک کتاب میں کسی کو دیکھنا ہو کہ قدماء نے کیا لکھا ہے اور کن الفاظ میں لکھا ہے، وہ اس کو تفسیر ماجدی میں پالے گا۔ محققین کی تازہ سے تازہ تحقیقات معلوم کرنا ہو تو اس کا مکمل مواد اس تفسیر میں پائیں گے۔ ایک لفظ کے اگر متعدد معانی مختلف مفسروں نے بیان کیے ہیں، اگر ان کو کوئی یک جا رکھنا چاہے تو اس کو اس تفسیر میں مل جائے گا۔ نحوی ترکیب کے کسی گوشے یا شوشے میں الجھن پیش آرہی ہو تو تفسیر ماجدی میں اس کا حل ہے _____ واعظانہ اسلوب اور دل کو نرم کرنے والے اور قلب کی سختی کو موم بنانے والے واقعات جو روح المعانی آلوسی میں ملتے ہیں، وہ بھی یہاں موجود ہیں۔ انداز بیان فلسفیانہ اور علمی موشگافیاں کرنے والوں کے جیسا خشک نہیں بلکہ اس میں زبان کی آب اور طرز بیان کی تب وتاب بھی ہے۔ ایسی مضمون آفرینی نہیں ہے جو کسی صاحب ذوق کے ذوق پر گراں ہو، نیز زبان و ادب کی چاشنی پر معانی کو قربان کیا ہے اور نہ کوئی ایسی بات لکھی ہے جو سلف کے اقوال سے متعارض ہو''۔ (ملاحظہ ہو: تفسیر ماجدی نقد ونظر، ص: ۷۱، ۷۲)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ اپنے علمی سفر میں اس علم خالص سے جو دینی حقائق کو تسلیم کرنے سے گریز رکھتا ہے گزر کر اس علم تک پہنچے جو دینی حقائق کو بھی تسلیم کرتا ہے، پھر مزید اس سے آگے بڑھ کر دینی حقائق کو اولیت اور فوقیت دینے کی منزل تک پہنچے، پھر مزید ترقی کر کے انہوں نے اس کو اپنے فکر و اعتقاد کا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ اتنے مراحل سے گزرنے سے ان میں کسی مخالف مذہب صاحب علم کے علم سے خواہ وہ کتنا بڑھا ہوا ہو مرعوبیت نہیں رہی۔ وہ فلسفے کے بھی طالب علم رہے تھے اور اخلاق و اجتماع کو بھی انہوں نے اپنے مطالعے و تحقیق کی جولان گاہ بنالیا تھا، پھر اس سے ترقی کر کے وہاں تک پہنچے جہاں محدود علمی دائروں میں پھنس کر رہ جانے کا خطرہ بھی نہیں رہا اور جہاں سے فلسفہ و اخلاق و اجتماع کی کمزوریاں بھی ان کی نظر کی زد میں رہیں۔ وہ اگر ایک طرف علوم دینیہ سے اشتغال رکھنے والے شخص کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں، تو دوسری طرف عصری ذہن کو جو علم کے معروضی مطالعے تک محدود رہتا ہو، متأثر کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے قلم کو ایک خاص اثر پذیری اور ان کی تحریر کو رعنائی حاصل رہی جس کے زور سے جب وہ کوئی عام اور سہل عنوان اختیار کرتے تو اس میں بھی لطف پیدا کر دیتے تھے، چنانچہ عام ثقافتی اور سماجی موضوعات پر ان کی تحریریں بڑے شوق و ذوق سے پڑھی جاتی تھیں اور اس میں ان کے فقروں اور نکتہ آفرینیوں سے لطف و استفادے کا ایک باب کھل جاتا ہے، لیکن قرآن مجید کو جس کا کلام معجز بیان عظیم و پروقار زبان اور فصیح و بلیغ عبارت کا کامل وصف رکھتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ اس کو عظیم تقدس و عظمت حاصل ہے، مولاناؒ نے اس کی ترجمانی میں ادب کی بے باکی اور عبارت کی اثر انگیزی کو احتیاط کے حدود سے نکلنے نہیں دیا ہے، بلکہ قرآن مجید کے الفاظ و عبارت کی روح کو سمجھنے اور سمجھ کر پوری امانت داری کے ساتھ اس کے مفہوم کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس طرح مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر قرآن اپنی ایک انفرادیت رکھتی ہے، اس سے ایک عصری تعلیم کا حامل، ایک عام ثقافت کا مالک اور علوم دینیہ کا ایک طالب علم سب ہی کو یکساں فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

تفسیر ماجدی کا یہ عظیم کام متعدد اہم خصوصیات کا حامل ہے۔ اس کا امتیاز دوسری تفسیری کتابوں پر خاص طور پر یہ ہے کہ اس کے مصنف نے صرف عربی تفاسیر کے مطالعے و واقفیت سے ہی کام نہیں لیا بلکہ عصر جدید کی تحقیقات و معلومات سے واقفیت اور یہودی و مسیحی کتابوں سے تائیدی و تصدیقی مواد کا حصول اور اس کے ذریعہ قرآنی معلومات کی تقویت و شہادت کا بھی پورا فائدہ اٹھایا۔ امید ہے کہ یہ تفسیر مصنف رحمۃ اللہ علیہ کے لئے بڑا ذخیرۂ آخرت بنے گی۔ (ملاحظہ ہو: تفسیر ماجدی نقد و نظر ص: ۷۷ تا ۷۹)۔

☆☆☆

طبقۂ نسواں پر رحمتِ عالم کا احسان

(م۔ق۔ن)

حدیث کی متداول اور مشہور کتابوں میں سے ایک کتاب مسند دارمی بھی ہے۔ مسند دارمی کی ایک موقوف روایت میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آکر اپنا یہ ذاتی قصہ بیان کیا کہ یارسول اللہ! ہم عہدِ جاہلیت میں اپنی بچیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے، چنانچہ میری ایک خوبصورت بچی تھی، جو میرے پیچھے پیچھے بھاگتی تھی، ایک دن وہ میرے بلانے پر خوشی خوشی آئی، میں گھر سے باہر آگے آگے چلتا گیا اور وہ میرے پیچھے پیچھے چلی آئی، میں چلتے چلتے ایک کنویں کے پاس پہنچا اور بچی بھی میرے ساتھ تھی، اچانک میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کنویں میں پھینک دیا، بچی چیخ چیخ کر مجھے پکارتی رہی ''یا ابت یا ابتِ'' میرے ابو جان، میرے ابو جان، اور میں نہایت بے رحمی کے ساتھ اوپر سے پتھر پھینکتا رہا، یہاں تک کہ اس کی آواز بند ہوگئی، اور ابھی تک اس کی آواز ''یا ابتِ یا ابتِ'' میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

آنحضرت ﷺ یہ دردناک قصہ سن کر بے تاب ہوگئے اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی، ایک صحابی نے اس بدو (دیہاتی) کو ملامت کی کہ تم نے بلا وجہ رسول اللہ ﷺ کے نرم دل کو بے چین کر ڈالا۔

آپ ﷺ نے اس آدمی سے کہا ذرا اپنا قصہ پھر دہراؤ! اس نے دوبارہ بیان کیا، اب آپ ﷺ کی یہ حالت ہوگئی کہ آنسوؤں سے ریش مبارک تر ہوگئی، پھر آپؐ نے اس آدمی سے کہا جاؤ، اسلام لانے کے بعد جاہلیت کا ہر گناہ اللہ نے معاف کر دیا ہے، اور اب نئے سرے سے عملی زندگی شروع کرو۔

یہ عورت ذات اور طبقۂ نسواں سے نفرت کی ایک لہر تھی جسے اللہ نے دین اسلام دے کر اپنے نبی اور رسول رحمۃ للعالمین ﷺ کے ذریعہ ختم کر دیا اور بلاشبہ دنیا اور خصوصا خواتین پر رحمت عالم کا یہ بہت بڑا احسان ہے جسے رہتی دنیا تک یہ مظلوم اور گمراہ انسانیت یاد کرتی رہے گی، خاص طور پر ہمارا ملک ہندوستان جہاں آج بھی ''ستی'' کی رسم کی وجہ سے اب تک اس کی یادگاریں موجود ہیں، جہاں مظلوم عورت اپنے پتی کی چتا پر زندہ جلائی گئی تھی اور آج بھی ہندو عورت اپنے خاندان کی وراثت میں حصہ پانے سے محروم ہے اور اس اکیسویں صدی میں لڑکیوں کو زندہ مارنے کی یہ رسم موجود ہے بس اس کا رنگ بدلا ہوا ہے۔

پہلے لوگ بچی کو زندہ دفن کر دیتے تھے اور اب معصوم بچی کو ماں کے پیٹ ہی میں سونوگرافی کی مشین پر دیکھ کر پیدا ہونے سے پہلے مار ڈالتے ہیں، کل جاہلیت کے زمانے میں اسے فعل لعنت کہا جاتا تھا اور آج کی ماڈرن دنیا میں فیملی پلاننگ۔

کیا ہم وارثین انبیاء عصرِ حاضر کے اس بھیانک ظلم اور سفا کی اور ماڈرن برائی کے خاتمے کے لئے فکرمند ہیں؟ کیا ہم نے اس ماڈرن برائی، ظلم اور سفا کی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا؟

☆☆☆